نواں باب

طفل

اس دنیااور اُس دنیا کے لوگوں میں رابطے کا ایک ذریعہ۔۔۔

قبر۔۔۔

اہل قبور کو معلوم کہ ملاقات آئی ہے۔۔۔

اہل زمین کو ایک سکون کہ میرا اپنا یہاں ہے۔۔۔

اپنے دو چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کی قبروں پر کھڑا نوید بھی آج اسی لیے یہاں آیا تھا۔ موسم ابر آلود تھا، ہلکی ہلکی بوندا باندی ساتھ ساتھ جاری تھی۔ سیاہ جینز پر، سیاہ شرٹ پہنے، اُسکی نظریں بھی سیاہ۔۔۔ اُسکا نصیب بھی سیاہ۔۔۔ اور اُسکا دل بھی۔۔۔

اگر وہ روتا نہیں تھا تو کیا اسے احساس نہیں تھا؟ اگر وہ بشریٰ کے لیے، اور صرف اور صرف بشریٰ ہی کے لیے خود کو مضبوط رکھے ہوئے تھا، تو کیا اُسکا دل نہیں دکھتا تھا؟ کیا اُسے نہیں تکلیف ہوتی تھی؟

اُسکے دل کے ٹکڑے، اُسکے جگر گوشے، اُسکے وجود کا حصہ، اُسکی اولادیں کتنی کم عمری میں یہاں آ گئے تھے۔ اُسے اُنکی قلقاریاں یاد آتی تھیں۔ اُنکے چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے بڑھ کر نوید تک آنا یاد آتا تھا۔ دل ٹوٹا جاتا تھا، پر خاموش رہتا۔ بھلا مرد بھی کبھی روتا ہے؟

مرد کو اگر کوئی سمجھنے والا ہو تو شاید وہ اپنا دل کھول کر رکھ دے۔ شاید وہ بتائے کہ آؤ دیکھو۔۔۔

دیکھو! کہ کتنا درد بھرا ہے اس دل میں۔۔۔

دیکھو! اس دل میں کتنے سوراخ ہیں، اور ہر سوراخ سے قطرہ قطرہ خون رستا ہے۔

دیکھو! کہ میرے زخم روزِ اول کی طرح تازہ ہیں اور تاحیات رہیں گے۔

''علی کل رو رہا تھا۔'' قبر کی نم مٹی پر نظریں جمائے اُسے دوست یاد آیا تو جیب میں رکھا موبائل نکالا۔ صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ یہاں سے اُسکے گھر کا راستہ پندرہ منٹ کا تھا، وہ باآسانی جا کر اُسکا حال احوال دریافت کر سکتا تھا۔ ویسے ہی کل رات سے اُسکی وجہ سے کافی پریشان تھا۔

جیب میں موبائل ڈال کر ایک نظر قبروں پر ڈالی، پھر گہری سانس کھینچتا پیچھے ہٹ گیا۔ ابھی اُسے علی کی طرف جانا تھا۔ آخری بار وہ اپنی نظروں میں گر کر، ذلیل ہو کر، رسوا ہو کر اور اپنے کردار پر بے شمار الزامات سہہ کر اُسکے گھر سے نکلا تھا۔ قسم کھائی تھی کہ دوبارہ اُسکے گھر میں قدم نہیں رکھے گا لیکن پتہ نہیں کیوں؟ اُسکی کل کی حالت دیکھ کر عجیب سا دھڑکا لگا ہوا تھا دل کو، کہیں ڈپریشن میں نہ چلا جائے۔ کہیں کچھ کر نہ لے اپنے ساتھ۔

خود سے کیے سارے وعدے بھلائے اور ہزاروں خدشے دل میں لیے وہ گاڑی میں بیٹھ گیا، یہ جانے بنا کہ۔۔۔۔

علی کی زندگی میں آئے طوفان اب تھمنے والے ہیں، اُسکی ڈوبتی کشتی کو کوئی کنارے لگانے والا ہے۔ کوئی اُسکے دل سے رستے خون کو اپنی محبت سے صاف کرنے والا ہے۔

---------+---------+--------

(مجھے نہیں معلوم کہ اپنی بیٹی کو سامنے دیکھ کر تم کیا کرو گے؟ تم مجھے مزید برا سمجھو گے یقیناً۔۔ سمجھنا بھی چاہیے کیونکہ میں اسی لائق ہوں۔)

علی کے ہاتھ میں وہ کاغذ تھا جس پر طے شدہ ہونے کی وجہ سے لکیریں پڑ چکی تھیں۔ اُسکے سامنے فاطمہ کے والد اور اُسکے سابقہ سسر بیٹھے تھے، اور اُنکے بلکل برابر میں پاؤں جھلاتی، ڈبے والا جوس پیتی، ہر شے کو غور سے دیکھتی نشمیہ۔۔۔

(مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم اسے میرے دوسرے شوہر کی بیٹی سمجھو گے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ تمہاری بیٹی ہے، تمہاری وہی بیٹی جسکے بارے میں، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں اُسے قتل کر چکی ہوں۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا، میں چاہتی تھی کہ تم مجھے جلدی طلاق دے دو۔ تم سے طلاق لینے کے سات ماہ بعد یہ پیدا ہوئی تھی۔ اور پھر چند ماہ مزید گزرنے کے بعد میں نے تقی سے شادی کر لی تھی۔ اور ایک سال قبل وہ بدبخت تمہاری بیٹی کو ایک شخص کو بیچنا چاہتا تھا۔)

''تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ میری بیٹی ہے؟''علی نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور آپکو لگتا ہے کہ میں اس بکواس پر یقین کر لوں گا؟ کیا میں نہیں جانتا کہ آپکے دوسرے داماد نے اُسے طلاق دے دی ہے۔ تو اب اُسکی اولاد کو مجھ سے منسوب کر کے مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں آپ لوگ؟''اُسکا لہجہ کاٹ دار تھا۔

''دیکھو!''اُسے دیکھتے وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے۔''تم اسے اپنی بیٹی ماننا چاہتے ہو تو مانو، نہیں ماننا چاہتے تو مت مانو۔ لیکن میرا اب اِس بچی سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ فاطمہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہے، اور جانے سے پہلے یہ خط اور اپنی بیٹی مجھے امانتاً دے گئی ہے کہ تم تک پہنچا دوں۔'' اُنکے جواب پر علی کا خون کھولا۔

(اُس نے میرے ساتھ کیا کیا؟ وہ میں نہیں بتاؤں گی۔ کیونکہ وہ سب میری سزا تھی۔ لیکن تمہاری بیٹی اس کی مستحق نہیں ہے۔ میں جا رہی ہوں، لیکن تمہاری امانت تمہیں لوٹا کر جا رہی ہوں۔ میں جیسی بھی ہوں، اپنی اولاد کی قاتل نہیں ہوں علی! نہ میں کبھی ایسا کر سکتی تھی۔ وہ سب میں نے تم سے طلاق لینے کے لیے کہا تھا۔)

''میں کبھی قبول نہیں کر سکتا کہ یہ میری بیٹی ہے۔ جھوٹ بول رہی ہے وہ عورت۔''وہ چیخا تھا۔ قریب بیٹھے سفیر صاحب نے اُسے تاسف سے دیکھا۔

''تم بے شک یقین نہ کرو! لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں اس بچی کو اب نہیں رکھوں گا۔ یہ فاطمہ کی اولاد تھی، اور وہ اب جا چکی ہے۔ اُسکے بعد یہ تمہاری ذمے داری ہے۔ تم اگر نہیں رکھنا چاہتے تو اسے یتیم خانے چھوڑ دو۔''گھر کی بیل بجی تو سفیر صاحب اُٹھ کر وہاں سے گئے۔

''تو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ خود ہی چھوڑ آتے یتیم خانے۔''اُس نے تڑخ کر کہا۔

''میں ایسا کر سکتا تھا، لیکن نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں تمہیں یہ بات معلوم ہو اور تم مجھ سے شکوہ کرو کہ میں نے تمہاری اولاد کو یتیم خانے کیوں چھوڑ دیا؟''سفیر صاحب کے پیچھے نوید وہاں داخل ہوا تھا۔

''بار بار اسے میری اولاد کہنا بند کریں۔''اُس نے پھر ضبط کیا تھا۔

(میں نے تمہاری بیٹی کو تمہارے حوالے کر کے اپنا ایک فرض تو پورا کر دیا۔ اگر تم سے تمہارا بیٹا لیا تو تمہاری بیٹی بھی تمہیں واپس کر رہی ہوں۔ اب یہ تم پر ہے کہ اسے اپنی بیٹی مانو یا یتیم خانے چھوڑ آؤ۔ اس سے زیادہ مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا، معافی بھی نہیں مانگنی کہ اُسکے میں لائق نہیں۔)

''میرا کام ختم ہوا، اب تم اگر اس بچی کو یتیم خانے چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہو، تو کم از کم میرے سر کوئی بوجھ نہیں ہو گا۔ کیونکہ میں نے تمہاری بیٹی کو تم تک باحفاظت پہنچا دیا ہے۔'' اتنا کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، ایک نظر علی کو دیکھا، پھر ایک نظر نشمیہ پر ڈال کر باہر نکل گئے۔

''ارے ایسے کیسے؟ آپ اسے یہاں چھوڑ کے نہیں جا سکتے، میں کیا کروں اسکا آخر؟'' علی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا پر وہ رکے نہیں۔

''یہ کس قسم کا مذاق ہے؟'' اُسکا دماغ کھول رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے علی؟'' نوید نے قریب آتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ کچھ کچھ بات تو اُسے بھی سمجھ آ رہی تھی۔

''یہ۔۔'' فاطمہ کا دیا خط اُسکے سامنے کیا تو نوید نے لیکر پڑھنا شروع کیا۔ سفیر صاحب جا کر نشمیہ کے پاس بیٹھے۔

''دور رہیں اس سے ابا! آپکی کچھ نہیں لگتی یہ، ہمیں نہیں معلوم کہ اسکی ماں کیا کھیل کھیل رہی ہے؟'' اُس نے اُن سے کہا پر اُنہوں نے سنی ان سنی کر دی۔

''تم کیا کرو گے اب؟'' خط پڑھنے کے بعد نوید نے اس سے پوچھا۔

''کیا کرنا ہے؟ یتیم خانے ہی چھوڑ کر آؤں گا اسے۔۔۔'' نفرت سے جواب دیا۔

''اور اگر یہ تمہاری بیٹی ہوئی تو؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''خدا کا واسطہ! اب تم یہ نہ کہو۔'' وہ چڑا۔

''اگر یہ تمہاری ہی بیٹی ہوئی تو؟'' اُس نے اپنا سوال دہرایا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟'' وہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

''اُسکا برتھ سرٹیفکیٹ ہے میرے پاس۔''سفیر صاحب نے درمیان میں کہا۔

''برتھ سرٹیفکیٹ کی صداقت پر کون بھروسہ۔۔۔''عجلت میں کہتا علی تھما۔اور رک کر اُنہیں دیکھا۔

''آپکے پاس؟''حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! جس دن فاطمہ یہاں آئی تھی، تو وہ صرف احمد سے ملنے نہیں بلکہ مجھے یہ بات بتانے بھی آئی تھی۔''اُنہوں نے سکون سے کہا۔

''اور آپ اُسکی ہر بات پر ایمان لے آئے؟''اُس نے طنزاً کہا۔

''ہاں!''اُنکے سکون میں رتی بھر فرق نہ آیا۔ علی نے خون کا گھونٹ بھرا، نوید کے سامنے وہ اُن سے کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔

''میری بات مانو! ابھی اسے یتیم خانے نہ چھوڑو۔''نوید نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں؟'' وہ تلخ ہو رہا تھا۔

''غور سے سنو علی! اگر یہ واقعی تمہاری بیٹی ہوئی تو؟ تم ساری عمر اسے یتیم خانے چھوڑنے پر پچھتاتے رہو گے۔ بہتر ہے کہ ابھی اسے گھر میں رکھو اور ڈی این اے ٹیسٹ کرواؤ۔ ٹیسٹ سے سچ سامنے آجائیگا۔''اُس کی بات ٹھیک تھی۔

''لیکن آج تو میری میٹنگ ہے اور پھر سائٹ پر بھی جانا ہے، ایک ہفتے سے میں آفس بھی نہیں گیا۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ٹیسٹ کل بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہونہہ۔۔''اُس نے سر ہلایا، پھر رک کر اُسے دیکھا''تم سے تو پوچھا ہی نہیں میں نے کہ صبح صبح یہاں کیسے آئے؟ سب خیریت تھی؟''

''میں بس تمہاری خیریت دریافت کرنے آیا تھا۔''سفیر صاحب کی موجودگی کی وجہ سے کہہ نہیں سکا کہ کل رات والی تمہاری حالت سے پریشان تھا۔

''میں ٹھیک ہوں اب، تم بیٹھو!''اُسے احساس ہوا کہ وہ کافی دیر سے کھڑا ہے۔

''نہیں میری ڈیوٹی کا وقت ہو چکا ہے۔ مجھے نکلنا ہو گا۔'' فاطمہ کا دیا ہوا کاغذ علی کی طرف واپس بڑھاتے ہوئے کہا''تم مجھے بتانا اگر کسی بھی شے کی ضرورت ہو۔''

''شکریہ تمہارا۔'' پھر علی باہر تک اُسے چھوڑنے گیا۔ دروازہ بند کر کے اندر آتے ہوئے اپنے ہاتھ میں موجود کاغذ پر نظر پڑی، تو اندر غصّے کا اُبال اٹھا، اُسی کاغذ کو توڑ مڑوڑ کر ٹیبل پر پھینکتا وہ صوفے پر بیٹھی نشیہ پر ایک نگاہِ غلط بھی نہ ڈالتے ہوئے، اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پھر کچھ دیر بعد اپنا کوٹ پہنتے، ہاتھ میں لیپ ٹاپ بیگ لیے وہ اُسی تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ سفیر صاحب کی نگاہیں گولا بنے اس کاغذ پر تھیں جو وہ ابھی میز پر پھینک کر گیا تھا۔

''بات سنیں۔۔۔''جوس کا سٹرا منہ سے نکال کے نشیہ نے سفیر صاحب کو مخاطب کیا۔

''ہاں بیٹا! بولو۔''اُنہوں نے اُسکی طرف جھکتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

''یہ اتنے ڈراؤنے کیوں ہیں؟''اُس نے رازداری سے مرکزی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، جہاں سے علی ابھی ابھی گیا تھا۔ وہ ہنس دیئے۔

''وہ بس غصّے میں ہے۔'' اُنہوں نے سمجھانا چاہا۔

''مجھے بھی غصّہ آتا ہے، پتہ ہے ایک بار۔۔۔''وہ جذباتی انداز میں کہتی صوفے پر ہی کھڑی ہو گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے اُسکی باتیں سننے لگے تھے۔

---------+---------+--------

جزا اپنے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ بنی دیوار گیر صوفے پر بیٹھی تھی۔ یہ صفحہ سفید رنگ کا تھا، ساتھ میں انڈے کی شکل کا چٹائی سے بنا جھولا بھی رکھا تھا۔ کمرے کو نقلی پودوں اور اصلی بوگین ویلا سے سجایا ہوا تھا۔ صوفے پر دونوں پاؤں اوپر کیے اپنے سامنے لیپ ٹاپ کھولے وہ کسی ضروری کام میں مصروف تھی، جب اُسکا فون بج اٹھا۔ ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر سکرین کو دیکھا پھر فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

''ہیلو!'' باؤل سے چپس کھاتے ہوئے اُس نے کہا۔

''جزایار! کیاغضب کاکارنامہ انجام دے دیاہے تم نے، میں توفین ہوگئی ہوں تمہاری۔'' بناکسی سلام دعاکے اُسکی کولیگ نے کہا۔

''ہیں؟ کس بارے میں بات کررہی ہو؟'' وہ حیرت سے سیدھی ہوئی۔

''ارے تم نے جوکل پولیس والوں کی دُرگت بنائی ہے۔ واہ آئرن لیڈی۔۔۔ واہ۔'' وہ جذباتی ہورہی تھی۔

''لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''سوسائٹی کافیس بک گروپ نہیں دیکھا؟ ہر جگہ تمہاری ویڈیو آرہی ہیں۔ کیسے تم نے اُن پولیس والوں کی بینڈ بجائی ہے۔ زبردست۔۔۔'' اُسکی بات پر جزا سکتے میں آئی۔

''کیاویڈیو وائرل ہوگئی؟''

''ابھی تک صرف فیس بک گروپ پر ہے۔ مگر میری تو دعاہے ہوجائے وائرل تاکہ اعلیٰ حکام تک اُن پولیس والوں کے کارنامے پہنچیں''

''تم ایک کام کرسکتی ہو؟''

''ہاں! بولو۔۔۔''

''تم مجھے وہ ویڈیو سینڈ کردوگی؟''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں؟'' اور کچھ ہی دیر بعد جزا کو وہ ویڈیو موصول ہوچکی تھی۔ ویڈیو ایسے بنائی گئی تھی کہ اُس کے ساتھ ساتھ وہ تینوں پولیس والے بھی واضع نظر آرہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے یہ ویڈیو اپنے تمام جاننے والے گروپوں میں پھیلادی تھی۔

''اب دیکھو میں کیاکرتی ہوں تم سب کے ساتھ؟'' اُس نے سکون سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ لیکن اُسکی یہ حرکت اُسے کافی مہنگی پڑنے والی تھی۔

---------+---------+--------

''ارے! آپ؟'' حسین کو پناہ گاہ کے دروازے پر کھڑا دیکھ شہباز خوش ہوا۔ وہ کوچنگ سینٹر سے واپس آرہا تھا۔

''تمہارے بھائی سے ملنے آیا تھا۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو باہر کیوں کھڑے ہیں؟''

''ابھی ابھی ہی تو آیا ہوں۔''

''اوہ اچھا اچھا! آئیں ناں اندر۔۔''شہباز نے چابی سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔اور اُسے اندر لے آیا۔ حسین تو لان میں ہی رک گیا جبکہ وہ بھاگتا ہوا اندر گیا۔

''رضا بھائی! رضا بھائی!۔۔۔آپکے اس دن والے دوست آئے ہیں۔''اُس نے ہانپتے ہوئے اُسکے سر پر پہنچ کر کہا۔

''ہیں؟اُس دن والے مطلب؟''بچوں کو گود میں بٹھائے ٹی وی دیکھتا رضا حیران ہوا۔پھر یکدم ہی اُسے یاد آیا۔''تم حسین کی بات کر رہے ہو؟''اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں وہی۔۔۔''

''کہاں ہے؟''

''یہ تو رہے میرے ساتھ۔۔۔''جلدی سے کہتے ہوئے مڑ کے پیچھے دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔

''ارے! کہاں گئے یہ؟''وہ سر کھجانے لگا۔

''تم اسکو پکڑو! میں دیکھتا ہوں۔''رضا نے محمد کو اُسکی گود میں دیا اور اُٹھ کر باہر آیا۔وہ سامنے ہی کھڑا تھا، سفید جینز پر سبز رنگ کی پوری آستینوں والی اونی ٹی شرٹ پہنے، آنکھوں پر ریم لیس چشمہ لگائے وہ اِرد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔رضا اُسکے پاس چلا آیا۔لیکن حسین اُسے نظر انداز کیے لان میں لگے پودوں کو گھورنے میں مصروف رہا۔

''کیسے آنا ہوا؟''اُس نے گلا کھنکھارتے ہوئے پوچھا۔

''دروازے سے۔۔۔''مختصر جواب دیا گیا تو اُسکے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

''میرا مطلب کون سی وجہ آپ کو یہاں کھینچ لائی؟''رضا نے ذرا گھما کر وہی سوال دہرایا۔

''تمہیں کب سے پھولوں اور کلیوں کا شوق ہو گیا؟''سوال نظر انداز کر کے پوچھا گیا۔

''جب سے زندگی میں بہار آئی ہے۔''اس بیساختہ جواب پر حسین تو حسین، خود رضا بھی حیران رہ گیا۔ بھلا یہ کیا نکل گیا اُسکی زبان سے ؟

''بہار؟''بھنویں اچکا کر اُسے دیکھا، رضا گڑبڑایا۔

''اس بہار کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''آنکھوں میں شرارت لیے چہرے پر سنجیدگی سجائے پوچھا۔

''بہار۔۔۔یعنی میرے بچے۔۔۔یہ سب اُنہی کا شوق ہے۔''دانت کچکچاتے ہوئے جتایا۔اب کور بھی تو کرنا تھا۔اور بھلا کونسی بہار ہو سکتی ہے اُسکی زندگی میں ؟

''آں ہاں۔۔۔میں سمجھ گیا۔ بلکل سمجھ گیا۔''اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا سمجھ گئے ؟''وہ مشکوک ہوا۔

''یہی کہ تمہاری ناراضگی دور ہو گئی۔''بات بدلنے میں تو یہ انسان ماہر تھا۔

''میں ناراض تھا کیا؟''رضا نے اس سے زیادہ خود سے پوچھا۔اچھا ایسا بھی تھا؟ مجھے کیوں نہیں معلوم ؟

''کیا مطلب ؟ تم ناراض نہیں تھے ؟''حسین بھی خوب اداکار تھا۔

''میں کسی سے بھی ناراض نہیں تھا۔''اب کے زرا سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر یہیں کھڑے کھڑے تواضع کرو گے میری؟''

''تمہاری تواضع بھی کرنی تھی؟''مزید حیرت سے پوچھا، بڑی انوکھی بات کی تھی اُس نے جیسے۔

''علاج کرواؤ اپنا۔''منہ بناتے ہوئے کہا اور اُسکا انتظار کیے بنا ہی لان میں رکھی کرسیوں پر جا بیٹھا۔رضا ہنس دیا، پھر اُسکے پاس ہی چلا آیا۔

''تمہاری فنکاریاں کبھی ختم نہیں ہوں گی نہ ؟''کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میں محبت جتاتا ہوں اور لوگوں کو فنکاریاں لگتی ہیں۔'' منہ بنا ہی رہا، اُس نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''تمہاری محبت بھی تو اچانک اچانک سے جاگتی ہے۔'' اب کے حسین ہنس پڑا۔

''تم سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن پچھلی دو دفعہ سے جو کچھ ہوا۔ تم سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔'' ذرا سنبھل کر اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ پرانی بات نکال کر اُسکا اچھا بھلا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''میں کل رات تمہارے پیچھے آیا تھا، لیکن تم جا چکے تھے۔'' حسین نے بتایا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے، اسی لیے پارکنگ میں تمہارا انتظار کیا تھا میں نے، لیکن پتہ نہیں تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو حسین حیران رہ گیا۔ عائشہ جی نے اندر سے چائے کے ساتھ کچھ لوازمات بھجوا دیئے تھے۔

''تم میرا انتظار کر رہے تھے؟'' اُسے یقین نہ آیا۔

''ہاں!'' اُس نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو تھوڑا صبر نہیں کر سکتے تھے؟ آ ہی جاتا میں کچھ دیر میں۔۔۔'' حسین نے اُسے لتاڑا۔

''اتنا وقت نہیں تھا میرے پاس۔۔۔'' رضا نے منہ چڑاتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھالی۔

''مقدّم نے کچھ ایسا بتایا تھا کل رات، کہ میں وہیں رک گیا۔'' اُسکا لہجہ سنجیدہ ہوا۔

''مقدّم نے؟'' اُس نے حیرت سے چائے کی پیالی میز پر واپس رکھی۔

''ایسا کیا کہہ دیا اُس نے؟''

''لیلیٰ یاد ہے تمہیں؟'' یکدم ہی پوچھا۔

''لیلیٰ کون؟'' پہلے تو اُسے واقعی یاد نہیں آیا۔ پھر خیال آیا کہ ذکر مقدّم کا تھا۔

''اوہ لیلیٰ۔۔۔مقدّم کی منکوحہ ؟''اُس نے تصدیق چاہی۔

''ہاں ! وہی۔۔۔اُسکا انتقال ہو گیا ہے۔''آہستہ سے کہے گئے، حسین کے الفاظ نے رضا کا چہرہ پل بھر کے لیے سیاہ کر دیا تھا۔ وہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ لیلیٰ کے لیے مقدّم کی محبت، اُسکے لیے پل پل پریشان ہونا، اُسکا والہانہ پن، اُس سے نکاح کی خوشی۔۔۔سب ایک لمحے میں اُس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

''پر۔۔۔کیسے ؟''اپنی آواز کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

''موت کی وجہ تو اس نے نہیں بتائی البتہ کہہ رہا تھا کہ۔۔۔۔''جواباً حسین سب بتاتا چلا گیا۔ رضا اندازہ کر سکتا تھا کہ لیلیٰ کی موت نے مقدّم پر کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے ؟ اور جو کچھ وہ بتا رہا تھا وہ بلکل اُسکے اندازے کے مطابق ہی تھا۔

''لیکن یہ سب اس نے کیوں بتایا؟''ایف آئی اے کے آفس میں اِس موضوع کے نکلنے کی وجہ وہ سمجھ نہ سکا۔

''علی کو سمجھانا چاہتا تھا، شرمندہ کرنا چاہتا تھا اُسے، کہ جو کچھ اُس نے تمہارے ساتھ کیا وہ شدید غلط فہمی کی بنا پر تھا۔''اُس نے بتایا تو نہ جانے کیوں، پر یہ بات رضا کو ناگوار گزری اور وہ اپنی ناگواری چھپا بھی نہ سکا۔

''تمہیں کیا ہوا؟''اُسکے چہرے کے تاثرات دیکھ کر سوال کیا۔

''میں نے اپنا حساب برابر کر لیا تھا علی سے، پھر اُسے مزید شرمندہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ معافی مانگ تو چکا تھا وہ، بات ختم کر دینی چاہیے تھی۔''حسین نے پوری آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا تھا۔

''کیا؟''اُسے خود کو گھورتا پا کر رضا نے کوفت سے پوچھا۔ حسین ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔

''کیوں ہنس رہے ہو؟ کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں میں۔''وہ سنجیدہ تھا۔

''تم لوگ ایک دوسرے کی غائبانہ وکالت کرتے ہوئے کتنے پیارے لگتے ہو۔''اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ بلائیں ہی لیے لے اُسکی۔۔۔کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔

''اور کس نے کس کی وکالت کی؟''اُس نے وضاحت چاہی۔

''مقدّم تمہاری وکالت کر رہا تھا، تم علی کی کر رہے ہو۔اور عمر، کل رات علی کے لیے مقدّم سے بحث کر رہا تھا، جبکہ کسی زمانے میں اُسکے لیے علی سے لڑ پڑا تھا۔واللہ! تم لوگ میری سمجھ سے باہر ہو۔''رضا نے کچھ نہ کہا۔

''کیا کہہ رہا تھا عمر؟''اُس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''آپ علی کے بارے میں جاننے کے لیے متجسس ہیں؟''اُس نے بھی سنجیدگی سے پوچھا۔آنکھوں میں ناچتی شرارت دیکھ، رضا نے خون کے گھونٹ بھرے۔

''میری بلا سے جو بھی کہا ہو۔میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔''اُس نے کندھے اچکاتے ہوئے ازلی بے نیازی سے کہا۔

''چلو چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ وہ بچی کیسی ہے اب؟''حسین نے بھی مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا۔

''کونسی بچی؟''اُس نے نا سمجھی سے دیکھا۔

''وہی۔۔۔کیا نام تھا اُسکا؟ارمینہ تھا شاید!''اُس نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''ارمینہ ٹھیک ہے اب، بچے جلدی بہل جاتے ہیں''اُس نے جواب دیا تو حسین اثبات میں سر ہلاتے ہوئے، کانٹے کی مدد سے کیک کا ٹکڑا توڑنے لگا۔رضا کچھ دیر تک ضبط کرتا رہا، اور وہ سکون سے کیک سے انصاف کرنے میں مصروف رہا۔

''بک بھی دو کیا کہا تھا عمر نے۔۔۔''بلآخر جب صبر جواب دے گیا تو چیخ کر بولا۔

''سوری! آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں؟''اداکاری تو ختم تھی اُس پر۔۔۔ رضا نے اُسے سنجیدگی سے گھورا تو وہ ہنس دیا۔

''دراصل! علی کافی پریشان ہے۔عمر بتا رہا تھا کہ۔۔۔''مختصراً کل رات پارکنگ والا واقعہ بھی کہہ سنایا۔ پتہ نہیں کیوں؟پر یہ سب سن کر رضا کا دل مزید خراب ہوا تھا۔زندگی اُس پر تنگ تھی تو اُن پر بھی قسمت کوئی مہربان نہ تھی۔

''یہ سب عمر کو کیسے معلوم؟''

''وہ دونوں کاروباری شراکت دار ہیں۔''

''ہمم!۔۔۔''وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ماحول میں عجیب سا بوجھل پن اُتر آیا تھا۔اتنی پریشانی کے بعد بھی علی نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس سے معافی مانگی تھی،اتنے ہی لوگوں کے سامنے جتنے لوگوں کے سامنے اُسکی عزت نفس پر حملہ کیا تھا۔کیا تھا جو رضا خاموشی سے سن لیتا؟اُس پر سے مقدّم نے بھی اُسے ٹھیک ٹھاک شرمندہ کر دیا تھا۔اب اس کو افسوس ہو رہا تھا۔اُس نے کبھی سوچا نہ تھا کہ دل بھی علی کی طرف داری کریگا۔پتہ نہیں کیوں؟پر ایسا ہو رہا تھا۔

''ہاں!یاد آیا،تمہیں کچھ دکھانا تھا۔''ماحول کے بوجھل پن کو حسین کی آواز نے توڑا تھا۔

''اب کیا دکھانا ہے؟''وہ چونکا۔

''میرا بیٹا،سوچا تھا اُسکی تصویر دکھاؤں گا تمہیں۔''اُس نے محبت پاش لہجے میں کہتے ہوئے موبائل کھولا تاکہ اُسے تصویریں دکھا سکے۔رضا اُسکے انداز پر مسکرایا۔

''تمہارا بیٹا بھی ہے؟''سوال عجیب تھا۔

''میری ایک بیٹی بھی ہے۔''جواب جتاتا ہوا تھا۔

''ماشاءاللہ۔۔۔''اُس نے خوشی سے کہا۔سچی خوشی۔۔۔

''عمریں کیا ہیں دونوں کی؟''اُس نے پوچھا۔

''بیٹا چار سال کا ہے،بیٹی ڈیڑھ سال کی۔۔۔یہ دیکھو!''مطلوبہ تصویر ملنے پر وہ موبائل اُسکی جانب بڑھانے ہی لگا تھا کہ بیل بج اٹھی۔

''اس وقت کون آگیا؟''وہ حیران ہوا۔سارے بچے تو گھر پر تھے،جزا بھی اندر ہی بچوں کو پڑھا رہی تھی۔حسین سامنے نہ ہوتا تو اُسی کو گمان کرتا۔

''میں دیکھتا ہوں ذرا۔۔''وہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔حسین نے سر ہلاتے ہوئے موبائل پیچھے کر لیا۔

---------+---------+--------

آج کا دن خاصا مصروف تھا، علی پورے ہفتے بعد آفس آیا تھا، لیکن پھر بھی عمر اُس سے بات نہیں کر پایا۔ آفس آتے ہی دونوں کو کلائنٹ سے ملنے جانا پڑا، پھر اپنی ٹیم کے ساتھ سائٹ پر جا کر کام دیکھنا تھا۔ وہاں سے واپس آتے آتے رات ہو گئی تھی۔ لہٰذا اُن دونوں کی کوئی بات نہ ہو سکی۔ واپسی پر عمر، مقدّم کے آفس چلا آیا۔

''تم ناراض ہو؟'' اُس سے ملتے ہی پہلا سوال یہی پوچھا تھا۔

''تم نے کوئی غلط بات کی تھی؟'' خاکی پینٹ پر آف وائٹ شرٹ پہنے، چہرے پر سنجیدگی لیے مقدّم نے سوال کیا۔

''نہیں!'' اُسکا جواب واضح تھا۔

''تو پھر میں کیوں ناراض ہوں گا؟'' نرمی سے کہتے اُسکے سارے خدشے دور کیے۔ عمر نے سکھ کا سانس لیا۔

''تم مصروف ہو؟'' اگلا سوال پوچھا۔

''فلحال تو نہیں۔۔۔''

''تو پھر چلو، تمہیں کہیں لیکر جانا ہے۔'' مقدّم حیران ہوا۔

''اس وقت؟'' گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے نو بج رہے تھے۔

''تم چلو بس۔۔۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں بلکہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔ مقدّم حیران ہوتا اُسکے پیچھے چل پڑا۔

''بتاتو دو کہ کہاں لے جا رہے ہو؟'' گاڑی میں اُسکے برابر بیٹھتے سیٹ بیلٹ لگاتے ہوئے کہا۔

''اغوا نہیں کروں گا تمہیں۔۔۔'' اُس نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ایسا بھی کیا ہے آخر؟'' ٹھیک ٹھاک برا سا منہ بناتے ہوئے کہا کہ دیکھ لو میں اس فضول سے سرپرائز سے بیزار ہو رہا ہوں۔ مگر اُسے بھی فرق نہ پڑا، در حقیقت وہ لیلیٰ کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیسے کرے؟ بلآخر اس موضوع کو کسی اور وقت کے لیے چھوڑ کر، فلحال وہ اُسے وہاں لے جا رہا تھا جہاں اتنے دن سے خود جانا چاہتا تھا پر جا نہیں سکا۔

''میں کسی کی طرف داری نہیں کر رہا تھا۔'' راستے میں یکدم ہی مقدّم نے وضاحت دی تھی۔

''میں نے کب کہا کہ تم کسی کی طرف داری کر رہے تھے؟'' ڈرائیو کرتے عمر نے حیرت سے پوچھا۔

''تم نے کہا تھا ناں کہ ہم رضا کو ہر غلطی کا مارجن دیتے ہیں تو علی کو کیوں نہیں؟ بات علی یا رضا کی نہیں ہے۔ بات عورت کی ہے۔ اس معاشرے کے نوّے فیصد طلاق یافتہ مردوں کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ اپنی سابقہ بیوی کو لائق تحقیر سمجھتے ہیں۔ اُنہیں لگتا ہے کہ جس عورت کو اُنہوں نے چھوڑ دیا، یا جس عورت نے اُنہیں چھوڑ دیا، وہ اب عزت کے قابل نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بلکل غلط سوچ ہے۔ اور مجھے بس اسی بات پر غصّہ آیا تھا۔ عورت تو اپنے سابقہ شوہر کو گالیاں نہیں دیتی، اُسکے دروازے پر جا کر تماشہ نہیں لگاتی۔ زیادہ سے زیادہ رو دھو لیتی ہے یا بد دعائیں دے لیتی ہے۔ لیکن مرد کی انا یہ گوارہ ہی نہیں کرتی کہ وہ اپنی سابقہ بیوی کو عزت کے ساتھ رہنے دے۔ وہ اگر محفل میں بھی اپنی سابقہ بیوی کا ذکر کرتا ہے تو حقارت سے۔'' اُسکی بات درست تھی، عمر جواباً خاموش رہا۔

''تم جانتے ہو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں جو بات ایک بار کہہ دی، اُسکی یقیناً کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔ جیسے میں کسی زمانے میں سوچتا تھا کہ اللہ نے مردوں کو کیوں کہا کہ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو، تو پھر نہ اُنہیں زبردستی روکو، نہ اُنکا حق مہر دینے میں دیر کرو اور نہ ان پر کوئی ظلم کرو۔ میرے نزدیک تو یہ بلکل اوبویس (حتمی) بات تھی کہ جب طلاق دے دی تو اب کیوں اُس عورت کو تنگ کرنا؟ لیکن اللہ کو تو معلوم ہے۔۔۔ اُسے معلوم ہے کہ مرد کبھی بھی اُس عورت کو عزت نہیں دیگا، جسے وہ چھوڑ چکا ہے۔ اس لیے مسلمان مرد کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ اپنی سابقہ بیویوں کے ساتھ برا سلوک نہ کریں۔ اور ویسے بھی جب ایک عورت کو طلاق دے دی، تو اب وہ نامحرم ہو چکی۔ اور کسی غیرت مند مرد کو زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی غیر عورت کے بارے میں بات بھی کرے۔'' اُسکا ایک ایک لفظ دل میں اترا تھا۔

''تمہاری ہر بات سے اتفاق ہے لیکن۔۔۔'' وہ رکا۔

''لیکن؟''

''لیکن علی ایسا نہیں ہے۔ میں اُسکے کسی عمل کی جسٹیفکیشن (وضاحت) نہیں دے رہا۔ جو بھی اُس نے کیا، یقیناً غلط کیا۔ لیکن وہ اتنا گھٹیا انسان بھی نہیں ہے۔ پچھلے دو سالوں میں اُس نے مجھے کبھی پتہ بھی نہیں چلنے دیا کہ اُسکی طلاق ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ اُس واقعے کے بعد، میں

اُس سے ملنے اُسکے گھر گیا، تب بھی اس نے مجھے نہیں بتایا۔ وہ چاہتا تو دل کھول کر اپنی سابقہ بیوی کی برائی کر سکتا تھا، پر نہیں کی۔ یہاں تک کہ جب رضا اُسے، اُسی بات کا حوالہ دے رہا تھا، وہ اُس وقت بھی اپنی سابقہ بیوی کے خلاف ٹھیک ٹھاک الفاظ استعمال کر کے اپنی پوزیشن کلیئر کر سکتا تھا۔ پر اُس نے اِن میں سے کچھ بھی نہیں کیا۔ اُس روز جو بھی ہوا، وہ اُس نے سابقہ شوہر ہونے کے ناطے نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ صرف ایک باپ تھا جسکا بچہ چھیننے کے لیے اُسکی ماں آئی تھی۔ اور بس۔۔۔ ہاں! لیکن میں مانتا ہوں کہ اُس نے جو کیا وہ اُسے ہر گز نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' عمر اپنے نظریے سے بات کر رہا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا، اپنے پیاروں کی ہر غلطی کا کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ لیتا تھا۔

''اور میں رضا کی غلطی کو بھی صحیح نہیں کہہ رہا۔ اُسے بدلا لینا ہی تھا تو اپنے ماموں سے لیتا۔ اس طرح اُنکے گھر کی عورتوں کا تماشا محلّے میں لگانا اُسے بھی زیب نہیں دیتا۔'' اب کہ مقدّم نے رضا کی غلطیوں کی بھی نشان دہی کی۔

''پتہ نہیں ان دونوں کی شخصیات اتنی مسخ کیسے ہو گئی ہیں؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دونوں اس طرح کا رویہ بھی رکھ سکتے ہیں۔'' وہ دونوں سے ہی نالاں نظر آ رہا تھا۔

''ہم سمجھائیں گے دونوں کو۔'' عمر نے اُمید سے کہا تو اس نے حیرت سے دیکھا۔

''ہم سمجھائیں گے؟''

''ہاں! ہم۔۔۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو اُس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ پتہ نہیں وہ اُسے کہاں لیکر جا رہا تھا؟

ڈرائیو کرتے اُس نے سگنل پر گاڑی روکی، تو برابر میں چنگچی رکشہ آ رکا۔ اُس میں ایک دن بھر کا تھکا ہارا مزدور اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر تھکن کے ساتھ ساتھ نرمی اور مسکراہٹ نمایاں تھی۔ مقدّم نے غور سے دیکھا تو برابر میں ایک عورت بیٹھی تھی، غالباً اُسکی بیوی، وہ مسکراتے ہوئے، ہاتھ ہلاتے اُسے یقیناً دن بھر کی روداد سنا رہی تھی۔ اور وہ شخص محبت پاش نظروں سے بڑی محویت کے ساتھ اُسکی گفتگو سن رہا تھا۔ سگنل پر ہی ایک بچہ ہاتھوں میں گجرے لیے متلاشی نظروں سے اپنا مطلوبہ گاہک ڈھونڈھ رہا تھا۔ یکدم اُسکی نظریں چنگچی پر پڑیں، تو جلدی سے اُس تک آیا۔ پھر چند منٹ، اُس مزدور سے کوئی بات کرنے کے بعد، اُسے گجرے نکال کر دینے لگا۔ اُس شخص نے اپنی جیب سے دن بھر کی کمائی نکالی، پھر مڑے تڑے نوٹوں کے درمیان سے ایک خستہ حال نوٹ بچے کی جانب بڑھایا اور اُس

سے گجرے لیکر خاتون کو پہنا دیئے۔ سب کچھ تھا اس آدمی کے پاس، ساری دنیا کی دولت تھی اُسکی زندگی میں، سارے جہاں کی خوشی تھی اُسکے چہرے پر۔۔۔۔

اور مقدّم؟ دنیاوی اعتبار سے ایک پر کشش زندگی تھی اُسکی، پر کیا وہ اُسکے لیے پر کشش تھی؟ اُسکے پاس دولت نہ ہوتی، گاڑی نہ ہوتی، پہچان نہ ہوتی۔ بس لیلیٰ ہوتی۔۔۔۔

وہ بھی ایسے ہی کسی رکشے پر بیٹھا لیلیٰ کی ساری باتیں سنتا، اُسے گجرے خرید کر دیتا۔ لیکن اُسکے پاس سب تھا، نہیں تھی تو وہ ہی نہیں تھی، جسکے دم سے زندگی تھی۔

کوئی نئی دنیا کے نئے رنگوں میں خوش رہتا ہے

کوئی سب کچھ پا کے بھی یہ من ہی من کہتا ہے

کہنے کو ساتھ اپنے ایک دنیا چلتی ہے

پر چپکے اس دل میں تنہائی پلتی ہے

پتہ نہیں کون منچلا یہ گانا لگائے اُنکے ساتھ ساتھ چل رہا تھا؟ مقدّم کی نس نس کی آواز تھی ان اشعار میں، سگنل کب کھلا؟ گاڑی کب چلی؟ اُسے معلوم نہیں ہوا۔ ذہن وہیں کہیں رہ گیا، اُس شخص کے چہرے پر چھائی سچی خوشی نے اُسے اُداس تو کیا تھا، پر دل سے وہ اُسکی دائمی خوشی کی دعا کر رہا تھا۔

''آ گئے ہم۔۔'' گاڑی جھٹکے سے روکتے عمر نے کہا تو وہ خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔ نظریں گھما کر آس پاس دیکھا تو کوئی پوش رہائشی علاقہ نظر آیا۔

''تمہیں یاد ہے؟ ایک بار تم نے مجھے بتایا تھا کہ رضا اپنے ایک خواب کے لیے تنکا تنکا کر کے پیسے جمع کر رہا ہے۔'' اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ رکھے عمر نے اُسے مخاطب کیا۔ مقدّم کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا، اور پھر جیسے اُسے سب یاد آنے لگا، کچھ بھولی بسری سی باتیں، کچھ نوجوانی کے قصے، کچھ وقت کی گردش میں گم ہوئے یار۔۔۔ چہرے پر اُداس سی مسکان آئی۔

''ہاں! یاد ہے۔''سر ہلاتے، مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو جاننا نہیں چاہو گے کہ اُس نے اپنا وہ خواب پورا کیا یا نہیں؟''عمر نے مسکراتے ہوئے اُسے حیران کیا۔

''یقیناً! جاننا چاہوں گا۔''

''وہ دیکھو! رضا کا خواب۔''اپنے سامنے نظر آتے، بوگین ویلا سے ڈھکے خوبصورت سے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی؟''اُس نے بے یقینی سے کہا۔

''ہاں! اُس نے اپنا خواب نہ صرف پورا کیا بلکہ بہت ذمے داری سے نبھا بھی رہا ہے۔''اُس کے لہجے میں عجیب سا فخر تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''میں ایک بار آیا تھا یہاں، رضا کو بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تھا، دور سے۔۔۔ لیکن اُس سے ملے بنا چلا گیا۔ پھر کل جب تم ناراض ہو کر چلے گئے تھے، تب میں نے اس بات کا ذکر حسین کے سامنے کیا، تو اس نے مجھے تفصیل سے رضا کے بارے میں بتایا۔''

''تم جب یہاں آئے تھے تو اُس سے ملے بنا کیوں چلے گئے؟''اُس نے پوچھا۔

''ہمت نہیں ہوئی۔۔۔''مختصر جواب دیا۔ مقدّم نے ایک نظر اُس دروازے کو دیکھا، جسکی تختی پر بڑا بڑا سا پناہ گاہ لکھا نظر آ رہا تھا۔

''تو پھر آج ہمت کر لو۔''اُس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایسے کیسے چلے جائیں؟ اگر وہ۔۔۔''عمر نے کچھ کہنا چاہا۔

''وہ کیا؟ گھر سے تو نہیں نکال دیگا ناں!''اُس نے بات کاٹتے ہوئے کہا اور گاڑی سے باہر آ گیا۔ اب اُسکے قدم پناہ گاہ کی جانب تھے، عمر کو بھی ناچار اُسکے پیچھے آنا پڑا۔

---------+---------+--------

شیراز کسی ضروری کام میں مصروف تھا جب فیصل تیزی سے اُسکے پاس آیا۔

''کیاہوا؟''اُسے حواس باختہ دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''سر نے جس آدمی پر نظر رکھنے کہا تھا،اُسکی جانب سے پیش رفت ہو رہی ہے۔''

''تو یہ بات نوید کو بتاؤناں!''شیراز بگڑا۔

''سر نوید فون نہیں اٹھا رہے، کیا کروں؟''وہ بھی جھلّایا۔

''ٹھہرو! میں کرتا ہوں۔''شیراز نے اپنے نمبر سے اُسے فون کیا۔

آفس سے تھوڑا دور گاڑی چلاتے نوید کا موبائل بجا۔اُس نے ڈیش بورڈ پر پڑے موبائل پر ایک نظر ڈالی، سکرین پر شیراز کالنگ کے الفاظ نمایاں تھے۔

''اب یہ کیوں فون کر رہا ہے؟''اُس نے کوفت سے سوچا۔گاڑی چلانے کے دوران وہ فون استعمال نہیں کرتا تھا۔اور شیراز کی کال آنے کا مطلب تھا کہ کوئی ضروری بات ہے۔

''پانچ منٹ کی دوری پر رہ گیا ہے آفس،اب میں پہنچ کر ہی بات کروں گا۔''اُس نے سوچا اور موبائل کو بجتا چھوڑ دیا۔

''اب کیا کریں؟''دوسری جانب اُسکے فون نہ اٹھانے پر فیصل شدید پریشان تھا۔

''تم ایک کام کرو، نفری تیار رکھو۔ہم نوید سر کا انتظار نہیں کر سکتے۔''اُس نے عجلت میں اٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! تم تب تک سر کو تمام صورتحال،وائس نوٹ میں بتا دو۔''فیصل کہتے ہوئے باہر کی جانب بڑھنے لگا۔

''اُسکا رخ کس جانب ہے؟''شیراز نے پوچھا تو وہ رکا۔

''پناہ گاہ کی جانب جا رہا ہے وہ۔۔۔''جواب دیتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔جبکہ شیراز جلدی جلدی نوید کو وائس نوٹ بھیجنے لگا۔

---------+---------+--------

کچھ لمحے کو تو رضا کو واقعی سمجھ نہیں آیا کہ کیا کرنا ہے؟وہ ہرگز توقع نہیں کر رہا تھا کہ دروازے پر مقدّم اور عمر ہوں گے۔

''کیا ہم دروازے پر ہی کھڑے رہیں؟''مقدّم نے سادگی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں! آؤ۔۔اندر آؤ۔''ہڑبڑا کر جلدی سے راستہ چھوڑا۔عمر شرمندہ سا جبکہ مقدّم پوری ڈھٹائی سے اندر آیا تھا۔حسین بھی اُسے دروازے پر جما دیکھ کر وہیں آرہا تھا لیکن ان دونوں کو دیکھ کر قدموں کو بریک لگا۔

''تم لوگوں کو میرے گھر کا پتہ کیسے معلوم ہوا؟''دروازہ بند کر کے اُنکی جانب آیا۔

''مجھے تو عمر لایا ہے یہاں۔''سکون سے کہہ کر عمر کو ہکا بکا چھوڑ،خود وہ حسین کی طرف مصافحہ کرنے بڑھ گیا۔

''میں نے نوید سے لیا تھا۔''اُس نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

''اور اُسکے پاس کہاں سے آیا؟''یہ سوال حسین نے کیا۔

''چھوڑو جہاں سے بھی آیا ہو۔''رضا نے بات ختم کی۔''سب خیریت ہے؟''اتنے سالوں بعد اُس طرح ملنے پر کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا پوچھے؟

''مجھے معلوم ہوا کہ تم نے اپنے مقصد کو حاصل کر لیا ہے تو سوچا تمہیں مبارک باد دے دوں۔''بہت رسمی سے انداز میں کہا۔رضا مسکرا دیا۔

''مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم یہاں مل جاؤ گے''دوسری جانب مقدّم نے حسین کو آہستہ سے مخاطب کیا۔

''اُمید تو رضا کو بھی نہیں تھی،لیکن ایسا ہے کہ اسکے بچے اتنے پیارے پیارے ہیں کہ بار بار ملنے کا دل کرتا ہے۔''

''بچے تو سب کے پیارے ہی ہوتے ہیں۔''رضا نے درمیان میں کہا۔

''معذرت چاہتا ہوں تمہیں بنا بتائے اس طرح آ گیا۔''عمر سخت شرمندہ تھا۔

''کوئی بات نہیں،لوگ تو زبردستی بھی گھس جاتے ہیں۔''رضا نے حسین پر چوٹ کی،وہ ہنس دیا۔عمر حیران ہوا،آج رضا کا رویہ پچھلی تمام دنوں کی نسبت حیران کن تھا۔

''میں بچوں سے ملواتا ہوں، تم لوگ بیٹھو۔'' وہ کہہ کر قریب کھڑے لڑکے کی جانب مڑا ''اسلم! جاؤ بچوں کو لیکر آؤ۔'' اسلم سر ہلاتے اندر چلا گیا۔

''تم تو اس دن عمر سے ناراض ہو کر نہیں گئے تھے۔'' حسین نے کافی رازداری سے مقدّم سے پوچھا۔

''اُس نے منالیا۔'' خاصی سنجیدگی سے مذاق کیا گیا تھا۔

''ویسے مجھے نوید کی حرکتیں کچھ مشکوک لگنے لگی ہیں۔ بھلا اُسکے پاس رضا کا ایڈریس کہاں سے آیا؟'' اب کہ حسین نے کافی غیر متوقع بات کی تھی۔

''وہ ایف آئی اے آفیسر ہے۔'' عمر نے تصیح کی۔

''اور۔۔۔ کیا کر رہے ہو تم آج کل؟'' مقدّم نے رضا کو مخاطب کیا۔ جواباً رضا اُسے اپنے پیشے کے بارے میں بتانے لگا۔

''جزا آپی!'' اسلم نے اندر آکر اُسے مخاطب کیا۔

''ہاں! کہو۔۔۔'' بچوں کو پڑھاتی جزا نے کتاب سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

''رضا بھائی، بچوں کو باہر بلوا رہے ہیں۔ اُنکے دوست آئے ہیں کچھ۔۔۔''

''تم نے دوست کہا؟'' پاس بیٹھی کسی کتاب کی ورق گردانی کرتی عائشہ جی نے حیرت سے سر اٹھا کر پوچھا۔

''بتایا تو یہی تھا اُنہوں نے۔'' اُس نے کان سہلاتے ہوئے کہا۔ حالانکہ رضا نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا، اُس نے خود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ عائشہ جی کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ اُنہوں نے رضا کی زبان سے کبھی کسی کے لیے دوست کا لفظ نہیں سنا تھا۔

''پھر تو اُنھیں انتظار نہیں کروانا چاہیے۔'' اُنہوں نے جزا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلاتے کتاب بند کی اور ایک نظر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ لان میں رضا اپنے ہم عمر مزید تین مردوں کے ساتھ نظر آرہا تھا۔

''بچوں! آپ نے شور نہیں مچانا، اور بہت ادب کے ساتھ جا کر مہمانوں سے ملنا ہے۔ اُنکی خیریت دریافت کرنی ہے اور اُن پر ثابت کرنا ہے کہ آپ بہت اچھے میزبان ہیں۔'' اُس نے بچوں کو سمجھایا اور پھر اچھے سے اُنہیں باری باری کر کے باہر بھیجنے لگی۔

رضا کو بچوں کو نئے لوگوں سے ملوانے کا بہت شوق تھا، وہ ہر آنے جانے والوں سے اُنکا تعارف کرواتا، کچھ دیر بچوں کو اُنکے پاس بیٹھا رہنے دیتا تاکہ وہ بھی میزبانی کے آداب سیکھیں اور خود کو کسی سے کمتر نہ سمجھیں۔ ابھی بھی وہ بڑے شوق سے اُنہیں مقدّم اور عمر سے ملوا رہا تھا۔ مقدّم تو پنجوں کے بل ہی بیٹھ گیا، بچے بھی اُس سے مل کر خوش ہو رہے تھے۔

مسکراتے، معصوم چہرے اس بات سے انجان تھے کہ وہ دکھی دلوں پر پھوار بن کر برستے تھے۔ اُنکے غم اتنے بڑے تھے کہ اُسکے آگے اپنی ہر تکلیف ہیچ لگتی۔ رضا کا گھر، گھر نہیں زمین پر جنت تھا، اور اس جنت میں فرشتے بستے تھے۔

گاہے بگاہے رضا کی نظریں مقدّم کی طرف چلی جاتیں، اُس نے ابھی ہی تو جانا تھا کہ مقدّم لیلیٰ کو کھو چکا ہے۔ پھر بھی اس نے اپنا دکھ کتنے آرام سے چھپا لیا تھا، آنکھوں میں پوشیدہ غم جھلکتا ضرور تھا لیکن وہ ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

''یہ کون ہیں؟'' آٹھ رمشا نے پر تجسس لہجے میں رضا سے پوچھا۔

''مہمان ہیں میرے۔۔۔'' وہ دوست نہ کہہ سکا، عمر اُداسی سے مسکرا دیا۔

اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا، بیل ایک بار پھر بجی تھی، پر اس بار جو بھی تھا وہ ہاتھ رکھ کے بھول گیا تھا۔ رضا سے پہلے عظیم دروازے پر پہنچ گیا۔ اُس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ اگلا شخص اُسے دھکا دیتے ہوئے اندر آیا تھا۔ عظیم گرتے گرتے بچا۔

''ارے۔۔۔'' رضا اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر آگے بڑھا لیکن آنے والے کو دیکھ کر اُسکے قدم تھمے۔

وہ ایک باوردی پولیس والا تھا، اُسکے پیچھے مزید اہلکار اور دو لیڈی کانسٹیبل اندر داخل ہوئی تھیں۔

''کون ہیں آپ لوگ؟ اور اندر کس سے پوچھ کر آ رہے ہیں؟'' وہ پولیس اہلکار کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''آئے تو ہم پڑوس میں تھے لیکن مطلوبہ ملزمہ آپکے گھر میں موجود ہے۔ آپ اُسے ہمارے حوالے کر دیں، ہم چلے جائیں گے۔''

''کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟ یہاں کوئی ملزم نہیں ہے۔'' وہ سمجھا اُنہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

''ملزم نہیں ملزمہ'' پولیس والے نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''مس جزائے خیر۔۔۔ آپکے گھر میں موجود بچوں کی ٹیچر، اُنہیں ہی حراست میں لینے آئے ہیں ہم۔'' رضا کا دماغ بھک سے اُڑا تھا۔ باقی تینوں بھی کچھ حیران پریشان سے وہیں آئے تھے۔

''ایک منٹ! آپ ایسے کیسے کسی کو حراست میں لے سکتے ہیں؟ کوئی وجہ، کوئی جرم بتائیں اُسکا۔''

''پولیس والوں پر تشدد کرنا، اُنکی ویڈیو بنانا اور وائرل کر دینا۔ یہ جرم کیا ہے اُنہوں نے، آپ اُنہیں بلا رہے ہیں یا میں خود جاؤں۔'' وہ بدتمیزی سے کہتا آگے بڑھنے لگا۔

''ایک منٹ! اندر نہیں جا سکتے آپ۔'' اُس نے بازو سے پکڑ کر پولیس اہلکار کو پیچھے کیا۔

''دیکھیں! آپ ایک معزز انسان ہیں، میں نہیں چاہتا کہ آپکو بھی ساتھ ہی حراست میں لے لوں۔'' اُس نے اُسے تنبیہہ کی۔

''حد میں رہو اپنی۔۔۔ عظیم! جزا کو بلا کر لاؤ۔'' پہلے پولیس والے کو پھر عظیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں اُسے بلا ضرور رہا ہوں، لیکن میری اجازت کے بنا تم میرے گھر سے کسی کو بھی نہیں لے جا سکتے۔'' اُس نے لہو رنگ ہوتی آنکھوں سے اُسے دھمکی دی۔

''دیکھیں رضا صاحب! ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔'' اُسی لمحے جزا وہاں آئی، عائشہ جی ساتھ تھیں۔

''کیا کام ہے مجھ سے؟'' بے خوف آنکھیں، بے جگری سے پوچھتے، ایک لمحے کو بھی لہجہ نہ کانپا تھا۔

''آپکو گرفتار کرنے آئے ہیں محترمہ۔۔۔'' جزا کو دیکھ کر اُسکے چہرے پر خباثت چھائی تھی۔ رضا غیر محسوس انداز میں اُسکے اور پولیس والے کے درمیان آ کھڑا ہوا تھا۔

''گرفتاری کے وارنٹ دکھاؤ۔'' اُس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے سکون سے کہا۔

''ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں ہیں، جو کہا ہے وہ کرو۔ گرفتار کرو اُسے۔۔۔'' اُس نے بدتمیزی سے کہا۔ اس سے پہلے کہ رضا اُسکا منہ توڑ دیتا، جزا آگے بڑھی اور اگلے ہی لمحے زناٹے دار تھپڑ اہلکار کے منہ پر دے مارا۔

''حرام خور!۔۔۔ میرے باپ کے بارے میں تمیز سے بات کرو۔'' اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چبا چبا کہا تھا، اُسکے لبوں سے جھڑتے پھولوں نے وہاں کھڑے ہر شخص کو حیران کر دیا تھا۔ اہلکار کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اس سے پہلے کہ وہ کوئی بدتمیزی کرتا عمر نے پولیس والے کو روکا۔

''آپ اس طرح بنا وارنٹ کسی کے گھر میں نہیں گھس سکتے۔۔۔''

''بہت ہو گیا، منہ کیا دیکھ رہے ہو گرفتار کرو اسے۔''اُس نے اپنے دیگر اہلکاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، جزا تو ٹس سے مس نہ ہوئی لیکن رضا نے پورا ارادہ کیا ہوا تھا کہ آج ایک آدھ کی ہڈیاں تو توڑ دے گا، لیکن جزا کے قریب بھی نہیں آنے دیگا اُنہیں، پر مسئلہ یہ تھا کہ جزا کی طرف لیڈی کانسٹیبل بڑھی تھیں۔اُس کو بلکل سمجھ نہیں آئی کہ اب کیا کرے؟

''رکو۔۔۔''اُسی لمحے کھلے دروازے سے کوئی دھاڑتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔وہاں کھڑے ہر شخص کی نظریں میکانکی انداز میں دروازے سے اندر داخل ہوتے وجود پر پڑی تھیں۔

سیاہ جینز پر، سیاہ شرٹ پہنے اور اُس پر ہم رنگ جیکٹ ڈالے نوید، آنکھوں میں خون لیے اُس اہلکار کی طرف بڑھ رہا تھا۔اُسکے پیچھے فیصل اور شیراز مختصر سی نفری کے ساتھ داخل ہوئے تھے۔ نفری دروازے پر ہی رک گئی۔ محلے میں بھی ٹھیک ٹھاک تماشا لگ چکا تھا۔لوگ اپنے اپنے گھروں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔

وہ قدم قدم اٹھاتے اہلکار کے پاس آرکا۔

''سلام صاحب!۔۔۔''اُس نے گھبرا کر سلام جھاڑا۔

''کیا کر رہے ہو یہاں؟''آواز آہستہ، آنکھیں لہو رنگ، لہجہ خطرناک حد تک سرد۔۔۔ جسم میں لہو جماتا ہوا، رگوں میں سنسنی سی دوڑاتا ہوا۔

''صاحب!اس خاتون کو گرفتار کرنے کا حکم ہے، وہی کرنے آئے ہیں۔''اُس نے وضاحت دی۔

''وارنٹ ہے تمہارے پاس؟''اُسی لہجے میں پوچھا۔سب اُسے ہی دیکھ رہے تھے اور وہ اہلکار کو۔۔۔

''صاحب!اس خاتون نے پولیس والے پر تشدد اور۔۔۔''وہ کوئی وضاحت دینا چاہتا تھا۔

''وارنٹ ہے یا نہیں؟''اُسکی بات کاٹتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔لہجہ آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا، عائشہ جی نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا، بچے الگ سہمے ہوئے تھے۔اور ان سب میں اگر جو رضا اپنے پیچھے کھڑی جزا کا چہرہ دیکھ لیتا، تو اس پر یقیناً کوئی نیا انکشاف ہوتا۔وہ لڑکی جو خود کو گرفتار

کرنے آئی ہوئی پولیس کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے بھی خوف زدہ نہ ہوئی تھی، نوید کو سامنے دیکھ کر اُسکا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑا تھا، آنکھیں خوف سے ایسی ہو گئی تھیں، جیسے سارا خون خشک ہو گیا ہو۔

''صاحب! مجھے تو اوپر سے حکم۔۔۔''وہ منمنا رہا تھا۔

''ہاں یا نہیں؟''وہ چیخا نہیں تھا۔ حلق کے بل دھاڑا تھا۔ اُسکی دھاڑ تھی یا اُسکے چہرے پر چھائی سختی، وہاں سب کو سانپ سونگھا گیا۔

''نہیں۔۔۔''اگلے ہی لمحے نوید نے بائیں ہاتھ کا تھپڑ، اِس شدت سے اُسکے منہ پر رسید کیا کہ وہ لڑکھڑاتے ہوئے نیچے گرا اور اُسکا سر پاس رکھے گملے سے جا ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا شیراز نے گریبان سے پکڑ کر اُسے نوید کے سامنے دوبارہ کھڑا کر دیا۔ ماتھے سے بہتے خون نے اُسکا چہرہ لال کر دیا تھا۔ رضا نے پریشانی سے لان میں کھڑے بچوں کو دیکھا تھا۔ وہ اس لمحے اُنہیں اندر بھی نہیں بھیج پا رہا تھا۔ البتہ بڑے بچے غیر محسوس انداز میں چھوٹے بچوں کے سامنے آ کر کھڑے ہونے لگے تھے۔

''وارنٹ نہیں تھے تو کس کی اجازت سے یہاں آئے؟''نوید کا لہجہ ایک بار پھر سرد ہوا۔ آنکھوں میں اترا خون ہی مقابل کی جان نکالنے کے لیے کافی تھا۔

''مجھے حکم دیا گیا تھا کہ مس جزا کو کانسٹیبل فضل کے سامنے حاضر کروں۔''اتنی ہی شدت کا دوسرا تھپڑ پھر اُسکے منہ پر پڑا، ایک بار پھر وہ گملے پر گرا اور ایک مرتبہ پھر شیراز نے اسے اٹھا کر کھڑا کیا تھا۔

''وہ ہے کون ایسے حکم نافذ کرنے والا؟''نوید نفرت سے پھنکارا۔

''صاحب معاف کر دیں، میں تو غلام ہوں۔''ایک اور تھپڑ اُسکے منہ پر رسید کیا تو اب کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔

''اٹھاؤ اسے اور گاڑی میں ڈالو۔''نفری کو حکم دیتے اُس نے شعلہ بار نظروں سے، براہ راست جزا کو دیکھا تھا۔ جس کے ہاتھ لمحے بھر کو کانپے تھے۔

''تم گھر آؤ فوراً۔۔۔''لہجے کو حتی الامکان آہستہ رکھتے، چبا چبا کے اُسے حکم دیتا وہ وہاں کھڑے دوسرے کانسٹیبل کی جانب بڑھ گیا۔ اس حکم پر رضا نے شدید حیرت سے جزا کو دیکھا تھا، آنکھوں میں سوال واضح تھا۔ نوید کون ہے؟

''سر! رضا صاحب کا، اور خاتون کا بیان لینا ہو گا۔'' کانسٹیبل نے بہت زیادہ محتاط انداز میں اُس سے پوچھا۔

''رضا کا بیان یہیں لے لو، جزا کی طرف سے میں بیان دوں گا۔'' اُس نے رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''سر! اسٹیشن بھی تو کسی کو آنا۔۔۔''

''جتنا کہا ہے اتنا کرو، اسٹیشن میں خود جاؤں گا۔'' اُسکی بات کاٹتے ہوئے دھاڑا، کانسٹیبل نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جزا نے ایک نظر سوال کرتی رضا کی حیران آنکھوں میں دیکھا، پھر کانسٹیبل سے بات کرتے نوید کو۔۔۔ اگلے ہی لمحے رضا کو دوبارہ دیکھ کر آہستہ سے بولی۔

''میرا بھائی۔۔۔'' یہ جواب نہیں تھا، ڈیڑھ سو کلو کا بم تھا، جو اُس نے رضا کے سر پر بڑی شان سے پھوڑا تھا۔

''تم سب کے سب مجھے علاقے کے پولیس اسٹیشن میں ملو، ایک بھی کم نہیں ہونا چاہیے۔۔۔'' اُس نے اہلکار کے ساتھ آئی نفری کو حکم دیا اور دوبارہ جزا کی طرف رخ کیا۔

''تمہیں کچھ کہا ہے میں نے۔۔۔'' اُسے ٹس سے مس ہوتا نہ دیکھ، اس بار وہ اپنے لہجے پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

''جی بھائی!۔۔۔'' اُسکے لہجے سے خائف ہوتی وہ بنا اپنا سامان لیے ہی، سیدھا گھر کی طرف بھاگی تھی۔ نوید کسی پر بھی نگاہِ غلط ڈالے بنا باہر نکلا، باہر آیا تو وہ اپنے گھر کا دروازہ کھول رہی تھی۔

''میں اسٹیشن سے واپس یہیں آؤں گا، پھر بات کرتا ہوں تم سے۔۔۔'' چبا چبا کر کہتے وہ اپنی گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔

''آپکو جو تکلیف اٹھانی پڑی اُسکے لیے معذرت چاہتے ہیں، بس یہاں جو ہوا اُس بارے میں بتا دیجیے۔ مزید آپکو تنگ نہیں کیا جائیگا۔''

دوسری طرف شیراز، رضا سے معذرت کر رہا تھا، جبکہ اسکو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

زندگی نے آج کل انکشافات اور دھچکوں کا چولا اوڑھ لیا تھا۔

''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اُس کانسٹیبل فضل کی طرف سے کوئی بھی پیش رفت ہو تو مجھے اطلاع دینا؟''وہ پولیس اسٹیشن کے راستے پر تھے۔جب نوید نے اپنے برابر بیٹھے فیصل سے پوچھا۔

''سر! جزا صاحبہ نے اُسے تھپڑ مار دیا تھا تو مجھے لگا بات ختم۔۔۔''

''کس قسم کی بھونڈی وضاحت ہے یہ؟''اُس نے جھاڑا۔

''تمہارا کام فضل کی حرکتوں کی اطلاع مجھے دینا تھا اور تم نے کیا کیا؟''اُسکو شدید غصّہ چڑھا ہوا تھا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔''اُس نے غلطی تسلیم کی۔

''تمہاری معذرت کا کیا کروں میں؟ حد ہوتی ہے نااہلی کی۔۔۔''اب کہ فیصل خاموش رہا۔اُسکا غصّہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔گاڑی پولیس اسٹیشن پر رکی تو اس نے خود کو نارمل کرنا چاہا لیکن غصّے کا پیمانہ مزید بڑھ گیا۔

جس وقت اُس نے زخمی اہلکار اور اُسکے ساتھیوں کو لے جا کر، کانسٹیبل فضل کے سامنے پٹخا تھا،اُس وقت وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے سگریٹ پینے میں مصروف تھا۔اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر اٹھا تو سامنے کھڑے نوید کو دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

''سلام سر!۔۔۔''

''کس کے گھر بھیجا تھا اسے؟''بنا کسی تمہید کے،زمین پر زخمی پڑے اہلکار کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔

''اسے تو میں نے۔۔۔''وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

''جواب دو۔۔۔''نوید دھاڑا تو وہ دہل کر سیدھا ہوا۔

''سر! میں نے اسے محترمہ جزائے خیر کے گھر۔۔۔''

''میرے گھر بھیجا تھا تم نے اسے۔''حلق کے بل چیختے وہ اُسکے اوسان خطا کر گیا۔کانسٹیبل کو اُسکی بات سمجھنے میں دیر لگی تھی۔بھلا اس نے کب نوید کے گھر نفری بھیجی؟اتنی جرات تو وہ خواب میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی، میں نے تو اسے۔۔''

''جزا عالم، میری۔۔۔یعنی نوید عالم کی بہن ہے۔''اُسکی بات کاٹتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔اب فضل کو اپنی موت سامنے کھڑی نظر آئی تھی۔

''میں۔۔۔میں نہیں۔۔۔ غلطی ہو گئی سر!''خوف سے الفاظ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔

''گرفتار کرنے گئے تھے نہ اُسے، پھر ایف آئی آر بھی درج کی ہو گی۔ذرا دکھاؤ مجھے کہاں ہے؟''اُسکے اور کانسٹیبل کے درمیان میز تھی، وہ ایک قدم آگے بڑھ کر میز کے قریب آیا اور اُسکی طرف جھکتے ہوئے مزید سرد انداز میں پوچھا۔

''سر! میں آپ سے کہہ رہا ہوں مجھ سے غلطی ہو گئی۔''

''ایف آئی آر کہاں ہے؟''ایک بار پھر اُسکی دھاڑ نے در و دیوار ہلا دیئے تھے۔

''معاف کر دیں سر!''وہ منمنایا تھا اور اگلے ہی لمحے نوید نے اُسے گریبان سے پکڑ کر، بنا اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلے، اپنی طرف کھینچا۔ اس طرح کے اُسکا آدھا دھڑ میز پر تھا اور آدھا نوید کے سامنے، دوسرے ہاتھ سے نوید نے اُسکا جبڑا جکڑا۔

''میرے گھر، میری ہی بہن کو گرفتار کرنے کیلئے، نفری بھیجنے کی جرات کیسے کی تم نے؟ وہ بھی اس لیے کہ تم حرام خوروں کو اُسکی اوقات یاد دلادی تھی اُس نے؟''فضل کو لگا کہ اُسکا جبڑا ٹوٹ جائیگا آج۔۔۔

''وردی پہن کر تم قانون کی حفاظت کرنے کے بجائے اُسکی دھجیاں اڑاتے ہو؟ہاں؟''انگارہ ہوتی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے جبڑا مزید دبایا تو اُسکے منہ سے خون نکل پڑا۔

''مم۔۔۔معاف کر دیں۔''اُسکی زبان سے اور کوئی لفظ ادا نہیں ہو رہا تھا۔

''تم اور تمہارے وہ بیغیرت دوست اپنی نوکری سے تو برخاست ہوں گے ہی، لیکن جو کیا ہے اُسکی قیمت ادا کیے بنا تمہاری لاش بھی نہیں جائیگی یہاں سے۔''جھٹکے سے اُسے چھوڑا تو وہ منہ کے بل زمین پر گرا تھا۔

''میری والدہ کے گھر کے باہر سیکیورٹی کاانتظام کرو، میں آتاہوں تھوڑی دیر میں۔۔۔اور میرے آنے تک اسکااوراسکے ساتھیوں کا حساب ہو جاناچاہیے۔''شیراز کو حکم دیتاوہ فیصل کی جانب مڑا

''یہ اسٹیشن کس کے زیرِ نگرانی آتاہے؟فوراًمعلوم کرو۔اور پھر میری بات کراؤاُس نالائق سے۔۔۔''فیصل کو بھی حکم دیتاوہ وہاں رکا نہیں تھا۔

اختلاف اپنی جگہ، لیکن اپنی بہن پر نظر اٹھانے والوں کی آنکھیں نکال سکتا تھاوہ۔۔۔

''تم نے آخر مجھے کیوں نہیں بتایا جزا! میں انتظار کرتارہالیکن تم نے مجھے نہیں بتایا۔''گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اُسکادماغ اسی جگہ اٹکا تھاکہ جزا نے اس سے یہ سب کیوں چھپایا؟اب اس سے حساب کاوقت آگیا تھا۔

---------+--------+-------

''کیاتمہیں معلوم تھاکہ وہ نوید کی بہن ہے؟''

''میرے توفرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا۔''

''اب کیاکروگے؟''

''میری غلطی ہے،اُس نے مجھے بتایاتھاکہ پولیس والے تنگ کررہے ہیں اُسے،میں پہلے کوئی اقدام لے لیتاتو یہ نوبت نہ آتی۔''

''لیکن کیاتب بھی نوید کو معلوم نہیں ہوتا؟''سوال معقول تھا۔عمراور مقدّم جاچکے تھے،بچوں کو بھی ڈھیروں تسلی دینے کے بعداب وہ حسین کے ساتھ بیٹھا تھا۔حسین نہیں گیا تھا۔

''اُسے یقیناًسب معلوم ہوتااوراب بھی سب معلوم ہوگا۔لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جزاکواس محلے میں آئے ہوئے دوماہ ہوچکے ہیں۔ میں نے نوید کو کبھی یہاں آتانہیں دیکھا۔''رضاکادماغ اب تک ماؤف تھا۔

''مصروف ہوتاہوگا۔''

''ماں رہتی ہے اُسکی یہاں۔''بھلاماں سے ملنے کوئی کیوں نہیں آئیگا؟

''خیر! تم پریشان نہ ہو، اب تک تو نوید پورا پولیس اسٹیشن اُنکے سروں پر گرا کر آ چکا ہو گا۔'' حسین نے ہلکے پھلکے انداز میں تسلی دی۔

''میں نے تو تصوّر بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اس حد تک خوفناک تشدد کر سکتا کسی پر۔'' رضا کے لہجے میں بے یقینی تھی، ذہن میں خوش اخلاق سے، ہر دم مسکرانے والے نوید کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

''کسی پر نہیں، ایک باوردی مجرم پر۔'' حسین نے تصحیح کی۔

''ہاں! لیکن۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔'' اُس نے آرام سے کہا تو رضا نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''میں اور تم جس نوید کو جانتے تھے، وہ ایک اسٹوڈنٹ تھا، ایک نوجوان لڑکا اور ابھی جسے تم دیکھ رہے ہو، یہ اُسکا پیشہ ہے۔ میں نے اور تم نے تو اُسے آج دیکھا ہے، نہ معلوم اپنی سروس کے اتنے سالوں میں کتنے مجرمین کو ایسے تشدد کا نشانہ بنایا ہو گا اُس نے؟ اُسکا غصّہ مجرم پر تھا اس لیے تم چل (chill) کرو۔۔۔'' اُسے تسلی دے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

''جز اپر بھی غصّہ تھا وہ۔۔۔'' بڑبڑاتے ہوئے کہا تو حسین نے بیساختہ امڈتی مسکراہٹ کو لبوں پر ہی روکا، تو اُسکی پریشانی کی وجہ یہ تھی۔

''اُسکی بہن ہے، جیسے بھی بات کرے۔ تمہیں کیا؟'' چہرے پر سنجیدگی طاری کیے سوال کیا۔

''میں تو بس ایسے ہی کہہ رہا تھا'' ہاں واقعی! اُسے کیا؟

''خون خرابہ دیکھ کر بچے پریشان ہو گئے ہیں۔'' رضا نے بات بدلی۔

''تمہیں اس وقت بچوں کے پاس ہونا چاہیے۔ میں بھی چلتا ہوں بس۔۔۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے کی نسبت آج اُس نے کافی لمبا وقت رضا کے ساتھ گزارا تھا۔ اُس نے بھی اُٹھ کر مصافحہ کیا اور دروازے تک اُسکے ساتھ آیا۔

''تم آرام کرو اب، زندگی میں ویسے ہی آجکل بہت کچھ ہو رہا ہے۔'' حسین نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''ہاں! اب تو سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت گم ہونے لگی ہیں۔'' رضا نے تائید کی۔

''ویسے تم نے بتایا نہیں۔۔۔''مرکزی دروازے پر یکدم ہی رک کر وہ رضا کی جانب مڑا۔

''کیا؟''وہ حیران ہوا۔

''کونسی بہار آئی ہے تمہاری زندگی میں؟''غلطی ہو گئی تھی رضا سے۔۔۔اب اُسکے پیٹ میں آخر تک مروڑ اٹھتے رہنے تھے۔

''میں نے تمہیں بتادیا تھا۔''چبا چبا کر کہا۔

''مجھے یقین نہیں ہے۔''حسین نے آہستہ سے کہا۔

''میرے خیال سے تمہیں اب جانا چاہیے۔''حسین ہنستا ہوا پیچھے ہوا۔

''اگلی بار پوچھوں گا تم سے۔۔۔''وہ کیوں باز آتا؟وہ تو حسین تھا۔

رضا بس اُسے گھور کر رہ گیا۔۔۔

---------+--------+-------

سارا دن مصروف رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو تکلیف دہ باتیں یاد کرنے کا وقت نہیں ملتا۔سارا دن کام کر کے جب علی گھر پہنچا تو اس حد تک تھک چکا تھا کہ بس نہا کر سونا چاہتا تھا۔البتہ شدید بھوک نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔باورچی خانے میں رکھے فریج میں جھانکا،ملازم نے کھانا گرم کر کے میز پر پہلے ہی لگا دیا تھا،وہ پینے کے لیے کوئی سوفٹ ڈرنک ڈھونڈ رہا تھا۔سوفٹ ڈرنک تو نہ ملی،پر کولار کھا نظر آیا۔کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے،تو اُسے ہی باہر نکال کے گلاس میں ڈالنے لگا۔

''یہ نہیں پینی چاہیے،گندی ہوتی ہے۔''بڑی سمجھداری سے کہتی ہوئی بچکانہ آواز کانوں سے ٹکرائی تو ایک پل کو دماغ کام نہ کیا۔پر جب میز کے ساتھ ہی رکھی کرسی پر بیٹھی بچی کو دیکھا تو ذہن میں جھماکا ہوا،صبح والا واقع پوری جزئیات کے ساتھ نظروں کے سامنے آگیا۔علی کا سارا حلق کڑوا ہو گیا۔وہ جانے کب سے وہاں بیٹھی تھی؟اُسے کیوں نظر نہ آئی یا اُسکے دماغ میں سرے سے اُسکی موجودگی کا تصوّر ہی نہ تھا؟ وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔بھوک نہ لگی ہوتی تو بیٹھتا بھی نہ یہاں۔وہ کرسی سے اتر کر اُسکے قریب آئی،پھر اُسکی کرسی کے ہینڈل پر ننھے

ننھے ہاتھ ٹکائے۔پلیٹ میں حرکت کرتی علی کی انگلیاں تھمیں۔اتنی چنی سی تو تھی وہ،آدھی کرسی جتنا قد تھااُسکا،چہرہ اٹھا کر علی کو دیکھ کم اوراُس پر غور وخوص زیادہ کررہی تھی۔اُسکی موجودگی سے وہ ٹھیک ٹھاک خائف ہوا۔

''یہ گندی ہوتی ہے۔''ایک بار پھراُسے بتایا کہ وہ اپنا کتنا نقصان کررہا ہے؟علی نے جھک کراُسے سختی سے دیکھا،یقین تھا کہ وہ ڈر جائے گی اور دوبارہ اُسے مخاطب نہیں کرے گی لیکن۔۔۔

''آپ اتنے ڈراؤنے کیوں لگتے ہیں؟''آنکھیں پٹپٹا کر سوال کیا تواُس نے ضبط کا گھونٹ بھرا۔

''آپ بچوں سے بات نہیں کرتے کیا؟''اُسکی مسلسل خاموشی سے یہی نتیجہ اخذ کیا، وہ اب بھی چپ رہا تو وہ بیزار ہو کر دوبارہ کرسی پر اچھل کر جا بیٹھی۔کمر تک آتے بال،ماتھے پر بینگز کی صورت میں کٹے ہوئے تھے،اُسکی عمر کے حساب اُسکے بال کافی لمبے تھے۔نیلے رنگ کے چھوٹے بازو والے فراک میں پیر جھلاتی وہ علی کو گھورنے کا شغل جاری رکھے ہوئے تھی۔اُسکی مسلسل گھورتی نظروں سے خائف ہوتے،بڑی مشکلوں سے کھانا ختم کیا۔پھر پلیٹ سینک میں ڈالتے ہوئے کچن سے باہر نکل گیا۔

''یہ یہاں کر کیا رہی ہے؟اور ابّا کہاں ہیں؟''ذہن میں خیال کوندا تو قدم رکے،پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ اب بھی وہیں بیٹھی تھی۔اتنا بے ضمیر تو وہ نہیں تھا،ناچار اُسکے پاس واپس آیا۔

''بات سنو!''اُسے مخاطب کیا۔اُس نے جواب نہیں دیا۔

''تم سے بات کررہا ہوں بچی!''اُسکا کندھا ہلایا۔تو بچی نے نظریں اٹھا کر سخت ناراضگی سے اُسے دیکھا۔پھر کرسی پر ہی کھڑی ہوئی،کمر پر دونوں ہاتھ ٹکائے اور بھنویں چڑھا کر اُسے دیکھا۔

''میرا نام نشمیہ ہے۔''برائے مہربانی اسی نام سے پُکارا جائے اُسے۔۔۔

''جو بھی نام ہے تمہارا،یہاں کیوں بیٹھی ہو تم؟اور ابّا کیوں نہیں ہیں تمہارے ساتھ؟''بلکل اُسی کے انداز میں بھنویں چڑھائے پوچھا۔اور ایسا اُس نے عادتاً کیا تھا،جان کر نہیں۔۔۔

''ابّا کیا ہوتا ہے؟''اُسے سمجھ نہ آیا۔

''ابّا یعنی بابا، مطلب باپ۔۔''اُس نے سمجھانا چاہا۔

''اوہ۔۔۔''اُس نے سمجھ کر سر ہلایا۔ شکر اُسکی سمجھ آئی۔

''تو مجھے بتاؤ میرے ابّا کہاں ہیں؟''

''آپکے ابّا؟ وہ کون ہیں؟''علی نے خود کو کوسا، بھلا چار سال کی بچی کو رشتوں کا کیا پتہ؟

''چھوڑو ان سب باتوں کو، تم کیا کر رہی ہو یہاں بیٹھ کر؟''

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''وہ دھپ سے کرسی پر واپس بیٹھی۔

''تم نے کھانا نہیں کھایا؟''وہ حیران ہوا۔

''صبح کھایا تھا۔''مختصر جواب دیا تو اُس کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ بچی صبح سے بھوکی بیٹھی تھی، اور سفیر صاحب بھلا کہاں تھے آخر؟

''اچھا ٹھہرو! میں تمہیں کھانا نکال دیتا ہوں۔''وہ فریج کی طرف بڑھا۔

''اور پانی بھی۔۔۔''اُس نے حکم صادر کیا تو اُس نے بس سر ہلا دیا۔

''بھلا یہ کتنا کھاتی ہو گی؟''پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے سوچا۔ پھر ایک اندازے سے تھوڑا سا کھانا نکال کر اُسکے سامنے رکھا۔

''یہ لو، ختم کرو جلدی۔''پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

''کھاؤ!''اُس نے ایک نظر پلیٹ کو دیکھا پھر دوبارہ علی کو، پر بولی کچھ نہیں۔

''اب کھا کیوں نہیں رہی؟''اُس نے کوفت سے پوچھا۔

''مجھے خود سے کھانا نہیں آتا۔''منہ بسورتے ہوئے مسئلہ بیان کیا۔

''اس میں کیا مشکل ہے؟ چمچ سے اٹھاؤ اور منہ میں ڈال لو۔''اُس نے حل پیش کیا۔

''مجھے نہیں آتا ناں!''غصّے اور اُکتاہٹ کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا گیا۔

''تو میں کیا کروں پھر؟'' وہ بھی جھنجھلا گیا۔

''آپ کھلا دیں۔'' تجویز تھی، حکم یا مشورہ؟

''میں کیوں کھلاؤں؟'' اس فرمائش پر تو وہ حیران ہی رہ گیا۔

''کیونکہ مجھے کھانا نہیں آتا۔'' ایک ہی بات بار بار بتانی پڑ رہی تھی اس آدمی کو۔۔۔

''اف۔۔'' علی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ اُس نے کبھی احمد کو اپنے ہاتھ سے نہیں کھلایا تھا۔

''تم کوشش کرو ورنہ بھوکی ہی رہو۔'' چڑ کر کہا تو پہلے نشمیہ نے اُسے حیرت سے دیکھا، اور پھر سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اُسکی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو نمودار ہونا شروع ہوئے۔

''یا اللہ! اب رونا مت بلکل، ہرگز نہیں پسند مجھے رونا۔'' اُس نے اُسے ڈانٹنا چاہا۔ اُسکے آنسو دیکھ کر چڑ ہوئی تھی۔ مگر جواباً اُس نے گلا پھاڑ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے آخر؟ چپ کر جاؤ پلیز۔۔'' وہ گڑبڑا گیا، پر وہ چپ نہ ہوئی تو وہ اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔

''اچھا! ٹھیک ہے، میں کھلا دیتا ہوں تمہیں، پر تم رونا بند کرو۔'' ہار مانتے ہوئے کہا۔

''اوکے۔۔۔'' تمام آنسو ایک لمحے میں غائب ہو گئے۔ وہ حیران ہی رہ گیا، دیکھو تو ذرا اس ڈیڑھ فٹ کی فنکارہ کو۔۔۔

اب وہ چمچ کے ذریعے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اُسکے منہ میں ڈال رہا تھا۔ کبھی وہ اُسے نوالہ چھوٹا کرنے کو کہتی، کبھی کرسی پر کھڑی ہو جاتی، تو کبھی کوئی بات یاد آنے پر دوبارہ سے دھپ کر کے بیٹھتی اُسکا دماغ کھاتی، اُسے ٹھیک ٹھاک بیزار کر رہی تھی۔ اُسکی اس اچھل کود سے تنگ علی، ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتا دل ہی دل میں خود کو ایک ہی بات یاد کروا رہا تھا۔

''بس کل تک کی بات ہے۔۔۔ کل تک کی۔'' خود کو تسلی دیتے اُس نے گلاس میں پانی نکالا۔

''اتنا سارا۔۔۔'' وہ چیخ اٹھی تو گلاس میں پانی انڈیلتے اُس نے رک کر اُسے دیکھا۔

''میں تھوڑا سا پانی پیتی ہوں۔''انگلی سے تھوڑے سے پانی کی مقدار بتاتے ہوئے کہا۔ علی نے لب بھینچتے ہوئے پانی جگ میں واپس ڈالا اور واقعی تھوڑا سا پانی گلاس میں چھوڑ کر اُسکی جانب بڑھا دیا۔

''ہاں! اتنا۔۔۔''گلاس منہ سے لگایا، آدھا پانی پیا، آدھا کپڑوں پر گرایا۔

''اب ان گیلے کپڑوں میں جا کر سوؤ گی؟''اُس نے ناگواری سے پوچھا۔

''نہیں!'' نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔

''کپڑے بھی بدلنے آتے ہیں یا نہیں؟''

''آتے ہیں۔''زور و شور سے سر ہلایا۔

''جلدی جلدی ختم کرو اسے۔''عجلت میں کہتے وہ پھر سے نوالے بنا کر اُسے دینے لگا۔ آدھ کھلے دروازے کی دراڑ سے جھانکتے، یہ منظر دیکھتے سفیر صاحب حیرت زدہ سے تھے۔

---------+---------+--------

''خود کو اتنا عقلمند سمجھنے کا نتیجہ دیکھا تم نے؟''کمر پر ہاتھ باندھے وہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چکر کاٹ رہا تھا۔ قریب ہی جزا سر جھکائے کھڑی تھی، چہرے پر ذرا بھی شرمندگی نہ تھی اور اُسکی ماں کچھ حیران اور کچھ پریشان سی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔

''تم مجھے بتا سکتی تھی، بھائی کو بتا سکتی تھی۔ لیکن تم نے اپنی ناقص عقل کو استعمال کرنا زیادہ ضروری سمجھا۔ آخر کب ہم دونوں تمہاری طرف سے بے فکر ہونگے؟ ہمیشہ یہی فکر رہتی ہے کہ تم کہیں کوئی تماشہ نہ لگا دو۔''لب بھینچے کھڑی جزا اب بھی خاموش تھی۔

''بیٹا! تم معاف کر دو اسے، پروحید کو نہ بتانا۔ وہ بہت ناراض ہو گا۔''نوید نے اچھنبے سے اُنہیں دیکھا، اُسکی ماں کو اب بھی بیٹے کی ہی فکر تھی۔ بیٹی کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ رونما ہو جاتا، انکو پرواہ ہی نہ تھی۔

''آپ کو لگتا ہے کہ بھائی کو معلوم نہیں ہو گا؟ میں اُن سے اپنے بارے میں کچھ نہیں چھپا پاتا یہ کیسے چھپاؤں گا؟''

''مگر بیٹا۔۔۔''اُنہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

''مگر کیاامی؟آپکواس پر نظر رکھنی چاہیے،یہ کیا کرتی ہے؟کہاں جاتی ہے سب کچھ معلوم ہوناچاہیے آپ کو۔آپ اسکی طرف سے اتنی لاپرواہی کیسے برت سکتی ہیں؟''

''آپ توایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں نے سچ میں کوئی جرم کر دیاہو۔دو مرد مجھے چھیڑ رہے تھے تو کیااس میں میری غلطی ہے؟''اُس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''دو مرد تمہیں چھیڑ رہے تھے تو کیا تمہارے گھر کے مرد مر گئے تھے؟''وہ چیخا۔

''ہاں!مر گئے تھے۔''وہ اُس سے بھی زیادہ بلند آواز میں چیخی تھی۔

''جزا!۔۔''اُسکی ماں نے دہل کر اُسے دیکھا۔

''میرے گھر کے مرد مر گئے تھے۔اسی دن جس دن اپنی اپنی زندگیاں گزارنے کے لیے،مجھے اور میری ماں کو اکیلا چھوڑ گئے تھے۔جس دن باپ کے مرتے ہی اپنااپنا حصہ لیکر الگ ہو گئے تھے۔مر گئے تھے اُس دِن جب میری ماں ہسپتال میں پڑی تھی۔''نوید نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔اب وہ بے خوفی سے اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔

''میں تم سے کسی قسم کی کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا جزا!''وہ اُسکے سامنے سے ہٹا۔اور اپنی ماں کے پاس آیا۔

''آج سے یہ کسی غیر ضروری کام سے باہر نہیں جائیگی۔''جزا کے تو سر پر لگی تلوؤں پر جا بجھی۔

''کیابکواس کر رہے ہیں؟میں گھر میں بند۔۔''

''خاموش رہو!''اُسکی بات کاٹتے ہوئے وہ اتنی زور سے دھاڑا تھا کہ وہ ایک لمحے کو سہم گئی۔

''تمہیں ہر بار ہم نے چھوڑا ہے،لیکن اس بار نہیں۔۔۔کبھی تم کسی کا سر پھاڑ آتی ہو،کبھی بلاوجہ محلّے میں کسی سے الجھ پڑتی ہو۔میں تمہارے روز روز کے تماشوں سے تنگ آچکا ہوں۔اس بار تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔''اُسکو ڈانٹا ہوا وہ اپنی ماں کی طرف مڑا۔

''امی! گھر کے کاموں کے لیے میں ملازم بھجوادوں گا، باہر سیکیورٹی گارڈ کھڑے ہیں اُن میں سے ایک جزا کو اسکول چھوڑنے اور گھر پہنچانے کا فریضہ انجام دیگا۔ اگلی بار اگر مجھے ایسی کوئی بھی شکایت ملی تو نہ صرف بھائی کو اطلاع دوں گا، بلکہ اس کی نوکری بھی چھڑوا کر گھر بٹھادوں گا۔'' وہ جانتا تھا یہ دھمکی کتنی کارآمد ہے۔

''واہ واہ! زمانے کے ڈر سے اپنی عورتوں کو چھپالو، اُن سے جینے کا حق چھین لو۔ مگر جو مجرم ہے اُسے آزاد چھوڑ دو۔ اور پھر خود کو مرد کہو۔'' استہزائیہ انداز میں کہتے اُس نے زہر اگلا تھا۔ نوید کی کنپٹی کی رگ اُبھر کر معدوم ہوئی، چہرے پر موجود زخم کا نشان ایک لمحے کو واضح ہوا اور پھر چھپ گیا۔ وہ قدم قدم چلتا اُسکے قریب آیا۔

''تم پر یہ پابندیاں اس لیے نہیں لگائی کہ تم مجرم ہو۔ تمہاری غلطی یہ ہے کہ تم نے ہمیں بے خبر رکھا۔ اور یہ غلطی تم جب جب کرو گی، تب تب میں تمہیں اس سے کڑی سزا دوں گا۔ یہاں تک کہ تم یہ سیکھ لو کہ ہر کام جذبات سے نہیں بلکہ کچھ حکمت سے بھی کیے جاتے ہیں۔'' اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا تھا۔ اس وقت وہ کتنی مشکلوں سے خود پر قابو کیے ہوئے تھا، یہ وہ ہی جانتا تھا۔ ورنہ تو اُسکا خون کھول رہا تھا۔

''تمہیں احساس ہی نہیں ہے کہ تمہاری بیوقوفی کا خمیازہ ایک شریف گھرانے نے بھگتا ہے۔'' اس بات پر اُس نے ناسمجھی سے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''پولیس تمہاری وجہ سے آئی، لیکن کس کے گھر؟ رضاالٰہی کے گھر۔ پورے محلے کو یہ معلوم ہے کہ پولیس رضا کے گھر آئی ہے۔ لوگ اُس سے سوال کریں گے تم سے نہیں۔''

''لیکن اس میں میرا قصور۔۔۔'' پہلی بار اُس نے شرمندہ ہوتے کوئی وضاحت دینا چاہی۔

''تمہارا ہی قصور ہے۔'' اُسکی بات کاٹتے ہوئے وہ چیخا۔ ''تمہارا ہی قصور ہے جزا! کیا تم نہیں جانتی تھی کہ جو لوگ بیچ راستے میں اپنی وردی کا فائدہ اٹھا کر، تم پر آوازیں کس سکتے ہیں۔ وہ اپنے عہدے کا فائدہ اٹھا کر تمہارے گھر تک بھی آسکتے ہیں؟ تمہیں ایسی نوبت آنے سے پہلے مجھے بتانا چاہیے تھا۔'' اُسکا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

''بیٹا! جانے دو اس بار، اب سے میں نظر رکھوں گی اس پر، بلکہ وہ جو عورتیں اسے دیکھنے آئی تھیں ناں! وہ پسند کر کے گئی ہیں اسے، میں لگے ہاتھوں اسے رخصت کرتی ہوں۔''اس بات پر جہاں جزا کا دل رکا تھا، وہیں نوید نے بھی ناگواری سے اپنی ماں کو دیکھا تھا۔

''امی! میں اُس ان پڑھ اور گٹکا کھانے والے لالچی انسان سے شادی نہیں کروں گی۔''اُس نے چیختے ہوئے کہا تھا۔

''تمہیں تو میں۔۔۔''اُسکی ماں نے آگے بڑھ کر اسکے بال کھینچے۔

''امی!۔۔ کیا کر رہی ہیں آپ۔''نوید نے تیزی سے آگے بڑھ کر اُنہیں روکا''چھوڑیں اُسے۔۔''اُس نے اُنہیں پیچھے ہٹایا۔

''کیا کر رہی ہیں آپ یہ؟'' اُس نے اپنی ماں کو صوفے پر بٹھایا۔

''جب تک میرا باپ زندہ تھا، کسی کی ہمت نہیں ہوئی میرے ساتھ یہ سب کرنے کی۔ آج وہ نہیں ہیں، تو گھر ہوتے ہوئے بھی لاوارث ہو چکی ہوں میں۔''سرخ آنکھوں سے کہتی وہ وہاں سے باہر نکلی اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔

''آپ اس پر ہاتھ کیسے اٹھا رہی ہیں امی؟ بچی نہیں ہے وہ۔۔۔''اُس نے ناراضگی سے ماں کو دیکھا۔

''تو کیا کروں؟ اُسکی حرکتیں نہیں دیکھیں؟ میرا غصّہ بڑھا کر رکھ دیتی ہے ہر بار۔''

''غصّہ مجھے بھی آ رہا ہے، لیکن کیا میں ہاتھ اٹھا رہا ہوں اُس پر؟''اب کہ اُسکی ماں چپ رہی۔

''میں نے جو کہا ہے آپ اُسکا خیال رکھیں بس۔۔۔''وہ کہہ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''میں کل ہی بلاتی ہوں اُن لوگوں کو، اور نبٹاتی ہوں اسے، پتہ نہیں کہاں کی حور پری سمجھتی ہے خود کو؟ گٹکا کھانے والے سے شادی نہیں کروں گی۔۔۔ ہونہہ۔۔''وہ اپنی ہی کہے جا رہی تھیں۔ نوید نے تاسف سے اُنہیں دیکھا، پر کہا کچھ نہیں۔۔۔

''میں جا رہا ہوں۔ دروازہ لاک کر دیجئے گا۔''وہ کہہ کر چلا گیا، پر وہ وہیں بیٹھی رہیں۔

اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھتے نوید نے جیب سے موبائل نکالا اور کسی کا نمبر ملا کر فون کان سے لگایا۔

''ہیلو بھائی! کیسے ہیں آپ؟''اُس نے پوچھا۔ پھر دوسری طرف سے حال احوال جاننے کے بعد بولا۔

''آپ سے ایک اہم بات کرنی ہے۔ جزا کے حوالے سے۔۔۔''

نوید کے جانے کے بعد اُسکی ماں نے، دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی، پر اُسکے کچھ ہی دیر بعد دوبارہ کھلنے کی آواز آئی، اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا۔

''یااللہ!۔۔۔یہ پھر باہر نکل گئی؟ میں کیا کروں اس کا؟'' اُنہوں نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا دیا۔

---------+--------+-------

اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا رضا کچھ پریشان سا تھا۔ پڑوس والے گھر سے مسلسل لڑنے کی آوازیں اُبھر کر معدوم ہو رہی تھیں۔ نوید کے غصّے کا اب اُسے کوئی بھروسہ نہ رہا تھا، نہ جانے وہاں کیا ہو رہا ہو گا؟ اُس نے سوچا۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو یہاں سے وہاں ٹہلنے لگا، جزا کے گھر کے باہر اب تین عدد سکیورٹی گارڈ ہتھیاروں سے لیس کھڑے تھے۔ یہ اقدام یقیناً نوید نے ہی لیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے وہ اسی طرح اپنی بالکونی میں ٹہلتا رہا، پھر اُس نے نوید کو گاڑی میں بیٹھتے دیکھا، کچھ دیر تک وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا فون کان سے لگائے کسی سے بات کرتا رہا، پھر وہاں سے چلا گیا۔ اُسکے جاتے ہی، اُس نے جزا کو دروازے سے نکلتے اور غصّے سے پیدل کہیں جاتے دیکھا تھا۔ تینوں گارڈ کے چہروں پر پریشانی واضح نظر آئی تھی۔

''یہ اب کیا کر رہی ہے؟'' اُس نے سوچا۔ پھر گھر کی چابی اٹھاتے باہر نکل گیا۔

خاموشی سے اُسی سمت سفر کرتے، جس سمت اُس نے جزا کو جاتے دیکھا تھا، اُسے یقین تھا کہ نوید کے گارڈ کم از کم اُس کو مشکوک نہیں سمجھیں گے۔

اُسے زیادہ نہیں ڈھونڈھنا پڑا، قریب ہی فوٹ پاتھ پر بنی ایک بینچ پر بیٹھی جزا اُسے فوراً نظر آ گئی۔ سٹریٹ لائٹ کی پیلی روشنی اُسکے اوپر روشن تھی۔ وہ شاید رو رہی تھی، اُس کے اٹھتے قدم تھم گئے۔

ایسی ہی ایک پرانی رات نظروں کے سامنے آن ٹھہری۔ جب وہ بھی ایسے ہی غصّے میں گھر سے نکلا تھا، ایسے ہی کسی سڑک کنارے بینچ پر بیٹھا رو رہا تھا۔ تب کوئی آیا تھا اُسکے پاس۔۔۔

اُسے تسلی دینے، اُسے یہ بتانے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ یہ جانے بنا کہ اُسکا مسئلہ کیا تھا۔

بھلا کون تھا وہ مہربان شخص؟

اپنا وہ رحم دل اور مہربان دوست اچانک ہی یاد آ گیا تھا۔

آج کیا وہ عمر بن سکتا تھا؟ کیا کچھ لمحوں کے لیے وہ بھی عمر جیسا مہربان، اُسکے جیسا شفیق دل لا سکتا تھا؟

یقیناً۔۔۔ وہ کر سکتا تھا۔

عمر کو ذہن سے جھٹک کر آگے بڑھنا چاہا، پر ایسا کر نہ سکا۔ آج وہ اُسکے سامنے آیا تھا، لیکن کتنا تکلف تھا اُسکے انداز میں۔ کیسے بار بار شرمندہ ہو رہا تھا؟ بار بار اپنے بنا بتائے آنے کی وضاحت دیتا عمر، رات کے اس وقت اُسے شرمندگی کے گڑھے میں ڈال گیا تھا۔ بھلا کوئی اپنے محسن کے ساتھ ایسا کرتا ہے؟ ایسا رویہ رکھتا ہے کہ وہ آپ سے بات کرتے ہوئے بھی شرمندہ ہو۔

اپنے رویے پر افسوس کرتا وہ خاموشی سے اُسی بینچ کے دوسرے کنارے پر آ بیٹھا، جس پر جزا بیٹھی تھی۔

اُس نے چونکتے ہوئے سر اٹھایا، تو اپنے برابر میں رضا کو پایا۔ اس طرح کے دونوں کے درمیان کم از کم بھی دو انسانوں جتنا فاصلہ تھا۔ وہ بینچ کی ایک جانب تھی، تو وہ دوسری جانب۔۔۔

وہ اُسے دیکھ رہی تھی، پر وہ زمین پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

لاشعوری طور پر اُسکے کچھ کہنے کی منتظر جزا، اُسکے یہاں آنے پر حیران تھی۔ اور وہ خاموش۔۔۔

جب بہت دیر تک وہ کچھ نہ بولا تو اس نے سر جھٹک کر چہرہ واپس سامنے نظر آتے درختوں کی جانب کر دیا۔ سوسائٹی کی سڑک پر ویسے بھی اتنا ٹریفک نہیں ہوتا تھا۔ کافی دیر اسی طرح خاموشی چھائی رہی۔

''فریحہ اپنے شوہر سے طلاق نہیں لے رہی، اور اگر لے بھی لیتی ہے، تب بھی نہ وہ مجھ سے شادی کر رہی ہے نہ میں اُس سے۔۔۔''

سنّاٹے کو رضا کی آواز نے چیرا تھا۔ اُس نے جھٹکے سے چہرہ موڑ کر اُسے دیکھا۔ بھلا اُس نے کب ایسا کچھ پوچھا؟ اور وہ کیوں بتا رہا تھا اُسے؟

''تو؟'' لہجے کو عام سا بنانے کی ناکام کوشش کی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ میں کیا کروں پھر؟

''تو یہ کہ فریحہ صرف میری دوست ہے۔ایک بے بس ماں،ایک لاچار عورت۔۔۔جسے اس معاشرے کی سختیوں نے اُسکی اولاد سے دور کر دیا ہے۔اور میں ماؤں کی عزت کرتا ہوں۔دکھی بچے اور بے بس مائیں،ان کے لیے میں جو کچھ کر سکتا ہوں،وہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔اور۔۔۔''رک کر چہرہ موڑا اور جزا کو دیکھا۔

''اور؟''منتظر سماعتیں بے چین ہوئیں۔

''اور بس۔۔۔''کندھے اچکا کر عام سے لہجے میں کہا۔

''مجھے کیوں بتا رہے ہو؟''

''ایسے ہی! مجھے لگا کہ تمہیں بتا دینا چاہیے۔ورنہ دیر نہ ہو جائے۔''جزا کو دیکھتی آنکھیں چمکیں،چہرہ متبسم ہوا۔جزا نے رخ پھیر لیا،دل زور سے دھڑکا۔

''تمہارے بھائی نے،کچھ کہا تمہیں؟''فکر مند انداز میں کہتے،اُس نے جاننا چاہا۔

''میں اُسکے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔''چہرے پر یکلخت ناگواری اُتر آئی۔

''کیوں؟اپنے خون سے اتنی بیزاری کیوں؟''

''اپنا خون کبھی ایسا نہیں کرتا،کبھی نہیں۔۔۔''وہ تلخی سے بولی۔

''کیا کیا اُس نے؟تمہیں اُن لٹیروں سے وقت پر بچانے آ گیا۔تمہاری حفاظت کی،سارے معاملے سے تمہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال دیا؟''

''تم کچھ نہیں جانتے''نم آنکھوں کے ساتھ،دبی دبی آواز میں چیخی۔

''میں جاننا چاہتا ہوں۔''نرمی سے پوچھا۔

''میرے باپ کے مرتے ہی،میرے دونوں بھائیوں نے گھر بیچ دیا اور اپنا اپنا حصہ الگ کر لیا۔وہ گھر۔۔۔وہ گھر جو میرے باپ نے بنایا تھا،جس میں،میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔''

''تو؟ تمہیں تمہارا حصّہ نہیں دیا؟''

''دیا۔''

''تو اس بات پر ناراض ہو؟'' وہ واقعی نہیں سمجھا۔

''تو کیا یہ ناراض ہونے والی بات نہیں ہے؟''

''میرے نزدیک، بلکل نہیں!'' وہ حیران تھا۔

''تم پاگل ہو کیا؟ میرے باپ کی عمر بھر کی محنت کا اُنکے مرتے ہی حصے بخرے کر لئے۔ یہ کیسے بیٹے ہیں؟ بھلا باپ کی قبر کی مٹی بھی نہ سوکھی اور اُنہوں نے اپنا اپنا حصہ الگ کر لیا، اُنکی محنت کی کمائی سے۔ اُس گھر میں میری پوری زندگی گزری تھی۔'' وہ رو دینے کو تھی، لیکن کمال مہارت سے آنسو ضبط کر رہی تھی۔ آنکھیں، ناک اس کوشش میں سرخ ہو چکی تھیں۔

''تم اپنے بھائیوں سے اس بات پر ناراض ہو کہ اُنہوں نے وہ کام پورا کیا، جس کام کا اللہ نے اُنہیں حکم دیا تھا؟'' رضا کے سنجیدگی سے کیے گئے سوال پر وہ ساکت ہوئی۔

''میں نے ایسا نہیں کہا، میں تو بس یہ کہہ رہی ہوں کہ میرے باپ کے مرتے۔۔۔''

''مردے کے مرتے ہی وراثت تقسیم کی جاتی ہے جزا!'' وہ سنجیدہ ہوا۔

''وراثت کی تقسیم کا یہی شرعی طریقہ ہے۔ مردے کے مرتے ہی، اُسکا جنازہ ہونے کے فوراً بعد، اُسکا ترکہ تقسیم کر دیا جائے تو یہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔ اگر ورثاء وراثت تقسیم کرنے میں دیر کرتے ہیں، تو اسکا وبال اُنہی کے سر ہے۔'' رضا نے اُسکی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن میرے بھائیوں کو کون سا پیسوں کی کمی تھی جو۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔ رضا نے گہرا سانس لیا۔

''ہمارا مسئلہ معلوم ہے کیا ہے؟ ہم نے حلال کو حرام، اور حرام کو حلال بنا دیا ہے۔ ہم نے اپنی روایات اور نظریے کو اللہ کے قانون سے بڑا مان لیا ہے۔''

''نعوذ باللہ!''اُس کا دل دہلا۔

''ہاں! نعوذ باللہ۔۔۔ لیکن ایسا ہی ہے۔ وراثت کی تقسیم یہ نہیں دیکھتی کے کس بھائی کے پاس کتنا پیسہ ہے؟ وراثت سب کو برابر حق دیتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ورثہ کو اُس وراثت کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ اگر کوئی باخوشی اپنا حق چھوڑ دیتا ہے تو وہ الگ بات ہے۔ ہم کسی کو صرف اس بنا پر، کہ اُسکے پاس ہم سے زیادہ پیسہ ہے، وراثت میں اُسکے حق سے محروم نہیں کر سکتے، نہ ہی اُسے برا کہہ سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ظالم ہم ہوں گے۔'' مدلل انداز میں کہتا وہ اُسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ جواباً وہ خاموش تھی۔

''تم جانتی ہو کہ اللہ نے یہ قانون کیوں رکھا ہے؟''اُس نے پوچھا تو اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ بتانے کے لیے کہ یہ مال ہمارا نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ہم اسے قبر میں اپنے ساتھ نہ لیجاتے؟ حتیٰ کہ ساری عمر محنت سے کما کر پائی پائی جمع کر کے جائیداد بنانے والا باپ بھی اپنی اولاد کو وراثت سے محروم نہیں کر سکتا۔ عاق کرنے جیسا کوئی شرعی حق اللہ نے انسان کو نہیں دیا۔ بھلے اولاد نافرمان ہو، بدکردار خواہ کافر۔۔۔ یہ مال ہمارا نہیں ہے جزا! تو اس پر رونا کیسا؟''

''مجھے بس اپنے باپ کے گھر سے جذباتی وابستگی تھی۔''اب کہ وہ بولی تو آواز آہستہ تھی۔

''اُس گھر میں تم نے کون سا ساری زندگی رہنا تھا؟ بیٹیاں تو ویسے ہی چلی جاتی ہیں۔ ہمارے دادا، پردادا نے بھی ایسے ہی گھر بنائیں ہوں گے، یہ سوچ کر کہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، اور اُنکی آنے والی نسلیں اس کو آباد رکھیں گی۔ لیکن کیا ہوا؟ آج وہ گھر کہاں ہے؟ یہی قانون ہے جزا! ہر شے فانی ہے۔ کچھ بھی باقی نہیں رہنا۔ اور تمہارے بھائیوں نے تو تمہیں تمہارا پورا حق دیا، اگر تمہارا حصہ مار کھایا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی ناراض ہونے والی۔۔۔'' نرمی سے کہتے وہ اُسے، وہ باتیں سمجھا چکا تھا جو شاید وہ ساری زندگی بھی نہ سمجھ پاتی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''اُس نے مان لیا۔ یہ اچھی بات تھی۔

''اور تمہاری جذباتی وابستگی، تمہارے باپ کے بنائے اینٹوں کے گھر سے نہیں بلکہ تمہارے باپ کے خون، اُنکے بیٹوں سے ہونی چاہیے۔''

''لیکن میں اپنے بھائیوں سے اور بھی دیگر باتوں پر ناراض ہوں۔''فوراً سے لہجہ بدل کر کہا۔

''اتنا برا بھی نہیں ہے تمہارا بھائی!''اُسکے انداز پر وہ مسکرایا۔

''تم اُسے جانتے ہی کتنا ہو؟ ابھی ہی تو دیکھا ہے۔'' منہ بناتے ہوئے کہا۔ اور رضا ہنس پڑا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' ہنستے ہوئے کہا۔

''تم مذاق اُڑا رہے ہو میرا؟ تمہیں معلوم بھی ہے کتنی بری طرح ڈانٹ کر گئے ہے مجھے؟ بلاوجہ کی پابندیاں لگادیں مجھ پر، کہہ رہے تھے، تمہاری وجہ سے ایک معزز انسان کے گھر پولیس آئی اور۔۔۔'' وہ جذباتی انداز میں کہہ رہی تھی۔

پیلی روشنی میں چمکتی سانولی رنگت۔۔۔

اُس رنگت پر جچتا سیاہ لباس۔۔۔

شدت ضبط سے سرخ ہوتی، کاجل میں ڈوبی سیاہ آنکھیں۔۔۔

اُن سیاہ آنکھوں میں بار بار امڈتے آنسو۔۔۔

اور اُنہیں بہنے سے پہلے ہی صاف کرتے چوڑیوں بھرے ہاتھ۔۔۔

اور بس۔۔۔ رضا برباد۔۔۔

''نوید کی بہن ہے رضا!'' دماغ نے یاد دلایا پھر باز رہنے کو کہا۔ ''ساری دنیا میں اسی کو نوید کی بہن ہونا تھا؟'' دل نے دہائی دی۔

''تمہارا پورا نام جزائے خیر ہے؟'' یکدم ہی پوچھا تو، مسلسل بولتی جزا کی زبان کو بریک لگا۔

''ہاں!'' رک کر ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''میرا پورا نام رضائے الٰہی ہے۔'' پتہ نہیں اسکو کیوں بتایا؟

''اچھا نام ہے، ویسے پورا نام جزائے خیر عالم ہے میرا۔''

''اچھا نام ہے۔'' اُسی کے انداز میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑی۔

''تم رضا الٰہی کیوں کہتے ہو پھر؟'' اُس نے پوچھا۔

''نام میرا رضائے الٰہی ہی ہے۔بس !لوگوں نے آسانی کے کی رضاالٰہی کر دیا ہے۔''اُس نے بتایا۔

''تمہیں گھر جانا چاہیے،ورنہ تمہارے دروازے پر کھڑے گارڈاب تمہارے پیچھے آجائیں گے۔''پھر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔گھر جانے کے نام سے جزا کی کوفت ہوئی تھی پر ناچار کھڑی ہو گئی۔اب وہ دونوں گھر کے راستے پر گامزن تھے۔

کچھ ان کہی سی،کچھ ان سنی سی کہانیاں لیے۔۔۔

کچھ سمجھ کر نہ سمجھتے۔۔۔

کچھ نہ سمجھ کر سب سمجھتے۔۔۔

وہ دونوں۔۔۔

دو میں سے ایک نے گھر کی اس رہ پر چلتے دعا مانگی۔۔

اُس نے جزائے خیر مانگی۔۔۔

اب رضائے الٰہی کہ اُسے مل جائے۔۔۔

---------+---------+--------

رات کے اس پہر جب دنیا تھک کر سکون سے سونا چاہتی ہے،تب اس گھر کے لاؤنج میں ایک خوبرو مرد کمر کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھے سنجیدہ نظروں سے چہرہ جھکائے اُسے گھور رہا ہے۔بھلا کسے غور رہا ہے؟

اپنے سامنے کھڑی اُس ڈیڑھ فٹی چوزی کو،جو کمر پر ہاتھ رکھے بلکل اُسی کے کے انداز میں اُسے ہی گھور رہی تھی۔

''میرا راستہ کیوں روکا ہے؟'' سنجیدہ لہجے میں علی نے اُس سے پوچھا۔

''میں نے کپڑے بدل لیے۔''

''تو؟''

''مجھے سونا ہے۔''

''تو سو جاؤ جا کے، میں نے منع کیا ہے کیا؟''

''کہاں سوؤں؟''اصل مسئلہ تو یہ تھا۔ علی کچھ دیر سوچتا رہا۔

''آؤ میرے پیچھے۔۔۔''اُسی طرح کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے چل پڑا، اور وہ اُسکے پیچھے پیچھے۔۔۔ پھر اُسے لیے احمد کے کمرے میں چلا آیا۔ ہر شے ویسی ہی تھی جیسے احمد چھوڑ کر گیا تھا۔ آٹھ سالوں میں پہلی بار اس کمرے کو خالی دیکھ کر اُسکے دل کو ایک لمحے کے لیے دھکا لگا۔

''یہاں سوؤں؟''اُسکے پیچھے سے چہرہ نکال کر پوچھا تو وہ چونکا۔

''ہاں! سامنے بیڈ پر سو جاؤ جا کر۔''انگلی سے بستر کی جانب اشارہ کر کے جانے لگا۔

''آپ جا رہے ہیں؟''اُس نے پوچھا۔

''ہاں!''

''کیوں؟''اس سوال پر وہ حیران ہوا۔

''میں نہیں سوؤں؟'' اُسے بھلا اور کس زبان میں سمجھاتا؟

''یہاں سوئیں۔''بستر کی طرف اشارہ کر کے حکم صادر کیا۔

''میں یہاں نہیں سوتا۔''ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''کہاں سوتے ہیں؟''

''اپنے کمرے میں۔۔۔''اس سوال جواب سے وہ تنگ تھا۔

''مجھے بھی وہیں سونا ہے۔''ایک اور فرمائش۔

''کیوں؟''وہ حیران ہوا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''وجہ معقول تھی۔

''تو میں کیا کروں؟''وہ جھنجھلایا۔اور بس۔۔۔نشمیہ صاحبہ نے آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھرے اور رونا شروع۔۔۔

''رو کیوں رہی ہو اب؟''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''روتے ہوئے کہا۔

''تو اب میں کیا کروں؟ میں تو یہاں نہیں سو سکتا ناں!''وہ بے بسی سے بولا۔

''تو میں کہاں سوؤں؟''دونوں ہاتھوں کو آگے کر کے نچا نچا کے پوچھا۔

''میرے باپ کے کمرے میں۔۔۔''چبا چبا کر کہا۔

''وہ کہاں ہے؟''اس سوال پر علی نے بیزار منہ بنایا۔

''چلو!''کمرے کی لائٹ بند کر کے اُسے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ سفیر صاحب کے کمرے کے باہر پہنچ کر لاک پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ

''یہ والا کمرہ؟''نشمیہ نے جذباتی انداز میں پوچھا تو اس نے لاک چھوڑ کر اُسے گھورا۔

''آہستہ بولو! ابّا سو رہے ہیں۔''اُسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا اور دوبارہ دروازہ کھولا۔کمرے کی لائٹ بند تھی اور وہ بستر پر سکون سے سوئے ہوئے تھے۔

''اندر آؤ۔''آہستہ آواز میں کہتے اُسے اپنے پیچھے اندر لایا۔خاموشی سے سفیر صاحب کے برابر میں جگہ بنائی اور پھر اُسے لیٹنے کا اشارہ کیا۔ خلاف توقع وہ خاموشی سے لیٹ گئی تو وہ بھی سکون کا سانس لیتے ہوئے جانے لگا۔

''مجھے سردی لگ رہی ہے۔''یکدم ہی وہ چیخی تو وہ دہل کے پیچھے مڑا۔ایک نظر سفیر صاحب کو دیکھا، صد شکر کہ وہ سو رہے تھے۔پھر اُسکے قریب آیا۔

''تم سے کہا ہے نہ کہ آہستہ بولو۔''

''میں کیا کروں مجھے سردی لگی ہے؟''معصوم سامنہ بنا کر آہستہ آواز میں کہا۔ اس نے سر جھٹک کر اُسے چادر اوڑھادی۔

''اب تمہاری آواز نہیں آنی چاہیے۔چپ کر کے سو جاؤ۔''اُسے وارن کرتا وہ باہر آ گیا۔کچھ دیر دروازے پر ہی کھڑا رہا، پھر دوبارہ دروازہ کھول کر دیکھا تو چادر کے اندر آنکھیں بند کیے وہ پتہ نہیں کیا کیا بڑبڑا رہی تھی؟لیکن صاف ظاہر تھا کہ کچھ دیر میں سو جائے گی۔سکون کا سانس لیکر دروازہ پھر بند کیا اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر ڈھے گیا۔اتنا زیادہ تھک چکا تھا کہ کچھ دیر میں ہی اُس پر غنودگی چھانے لگی۔اچھا بھلا وہ نیند کی وادیوں میں جا رہا تھا کہ کہیں سے ٹھک ٹھک کی آواز آئی۔اُس نے کسمسا کر کروٹ بدل لی لیکن آواز پر دھیان نہ دیا۔آواز دوبارہ آئی تو اُسکی آنکھیں کھلی۔چہرہ گھما کر یہاں وہاں دیکھا پر کوئی نہ تھا۔اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ سونے ہی لگا تھا کہ آواز دوبارہ آئی،اب کہ وہ اُٹھ بیٹھا۔وہ جو کوئی بھی تھا،اُسکا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا لیکن بہت آہستہ آہستہ۔وہ کچھ حیران، تھوڑا پریشان سا دروازے پر آیا اور جیسے ہی دروازہ کھولا،وہاں کسی کو نہ پایا۔اس سے پہلے کہ دروازہ واپس بند کرتا،اپنے دائیں گھٹنے پر کسی چیز کا احساس ہوا۔ گردن جھکا کر دیکھا تو وہ سامنے کھڑی تھی،اُسکے گھٹنے پر ہاتھ مارتی اُسے اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی۔

''تم؟''حیرت کی شدت سے آنکھیں بڑی ہو گئیں،ابھی تو سلا کر آیا تھا اسے۔

''یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''مجھے وہاں نہیں سونا۔''ایک اور حکم صادر فرمایا۔

''کیوں؟''اس فیصلے کی وجہ سمجھ نہ آئی۔

''وہ بہت شور مچا رہے ہیں۔''

''کون؟ابّا؟''وہ حیران ہوا۔بھلا سفیر صاحب کیوں شور مچائیں گے؟

''ہاں!اتنی دیر سے آوازیں۔۔۔نکالے جا رہے ہیں۔۔۔نکالے جا رہے ہیں۔۔۔چپ ہی نہیں ہو رہے۔''تیز تیز بولتی وہ ہانپ گئی۔

''ہیں؟''اُسے سمجھنے میں وقت لگا کہ وہ سفیر صاحب کے خراٹوں کو شور مچانا کہہ رہی تھی،جب سمجھ آیا تو پچھلے ڈیڑھ ہفتوں میں پہلی بار وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔ لیکن اُسکا ہنسنا سامنے والی کو سخت ناپسند آیا۔

''مجھے نیند آرہی ہے۔'' برائے مہربانی ہنسنے کا شغل بعد میں کیا جائے اور میرا مسئلہ پہلے حل کیا جائے۔

''تو اب میں کیا کروں؟'' وہ دوبارہ سنجیدہ ہوا۔ جواباً وہ آنکھیں پٹپٹائے اُسے دیکھتی رہی بولی کچھ نہیں۔ بڑے تم ہو، مسئلہ بھی تم حل کرو۔

''اوکے! اندر آؤ۔'' ناچار دروازے سے ہٹ کر اُسے جگہ دی تو وہ اندر آگئی۔

''واؤ! اتنا پیارا روم؟'' علی کا نفاست سے سیٹ ہوا کمرہ دیکھ کر وہ تعریف کیے بنا رہ نہ سکی۔

''یہ میرا کمرہ ہے۔'' علی نے جتایا۔

''تو؟'' لٹھ مار انداز میں کہتی وہ اچھل کر بستر پر چڑھ گئی۔

''تو یہ کہ مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے۔ جسکے لیے جلدی سونا ضروری ہے لہٰذا مجھے تمہاری ذرا سی بھی۔۔۔ ذرا سی بھی آواز نہیں آنی چاہیے۔'' اُسکے پاس آکر انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے چٹکی بنا کر، اُسے سنجیدگی سے سمجھایا۔

''واؤ! یہ کیا ہے؟'' اُسے نظر انداز کیے، سائیڈ ٹیبل پر رکھا پیپر ووڈ اُسکی نگاہوں کا مرکز بنا تو فوراً سے اُٹھالیا، علی نے لپک کر وہ اُس سے واپس لیا اور جگہ پر رکھا۔

''لیٹو۔۔۔'' اب کہ سختی سے کہا۔ سمجھ گیا تھا کہ اُسے آرام سے کی گئی بات سمجھ نہیں آتی۔ وہ لیٹ گئی، پھر علی نے اسے چادر اوڑھائی، اتنی دیر وہ کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔

''کتنا بڑا روم ہے آپکا۔'' وہ خوش ہوئی۔

''آنکھیں بند کرو!'' علی نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا تو جلدی سے ننھی ننھی آنکھیں بند کرلی۔

''اب آواز نہ آئے تمہاری۔۔۔'' اُسے دھمکی دیتا دوسری جانب آکر بیٹھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی اور کچھ ہی دیر میں بے سدھ سو گئی۔ علی اُسے دیکھتا رہا۔

''یہ دن بھی آنا تھا کہ میں اپنی سابقہ بیوی کے دوسرے شوہر کی بیٹی پالوں گا؟'' دل میں نفرت ایک مرتبہ پھر بھرنے لگی ہی تھی کہ

اگر وہ تمہاری بیٹی ہوئی تو؟

نوید کے الفاظ کانوں میں گونجے۔

''لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ فاطمہ نے اُسے مار دیا تھا۔'' دماغ نے کہا۔

''اگر مار دیا تھا تو تقی سے فوراً شادی کیوں نہ کی؟ ایک سال کیوں لیا؟'' دماغ نے مخالفت کی۔ اُس نے تھک کر سر تکیے پر رکھ دیا۔ ایک نظر برابر میں مست سوئی نشمیہ کو دیکھا۔ اب تک اس بچی سے جو نرمی وہ برت رہا تھا، اُسکی وجہ صرف یہی تھی کہ نوید کے الفاظ نے اُسے غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ وہ پہلی فرصت میں اُسے یتیم خانے چھوڑ آتا۔ فاطمہ کے جھوٹ، اُسکے دھوکے، نوید کے الفاظ، اپنی زندگی، سب کچھ ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے، نیند نے ایک بار پھر اُس پر غلبہ حاصل کر ہی لیا تھا کہ

''سنیں!'' چھوٹے چھوٹے ہاتھ اُسکے بازو پر رکھ کر اُسے ہلات ہوئے، ایک بار پھر بھرپور طریقے سے اُسکی نیند میں خلل ڈالا گیا۔

''کیا ہوا؟'' وہ ہڑبڑا کر چیخا۔

''واشروم جانا ہے۔'' مسکین شکل بنا کر کہا۔

''کیا؟'' اُسکا دماغ فوراً سے اس بات کو ڈی کوڈ نہ کر سکا۔

''مجھے واشروم جانا ہے جلدی۔۔۔'' وہ چیخی۔

''تو جاؤ ناں!'' وہ ٹھیک ٹھاک جھنجھلایا تھا۔

''کہاں جاؤں؟'' دونوں ہاتھ آگے کر کے پوچھا۔

''وہ رہا سامنے دروازہ۔۔۔ جاؤ!'' بیت الخلا کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا!'' وہ جلدی سے اتر کر واشروم کے دروازے کی طرف گئی۔ لاک کافی اوپر تھا، لہٰذا اچھل اچھل کر اُسے کھولنے کی کوشش کی، پر ہاتھ نہ پہنچ سکا تو پلٹ کر مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھا۔ یہ ساری کاروائی دیکھتا علی بیزار ہوا۔

''یار!۔۔۔کیا مصیبت ہے۔''روتی شکل بنا کر تکیے پر سر پٹخا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔واشروم کا دروازہ کھول کر لائٹ کھولی۔

''دروازہ بند مت کرنا۔''کہتے ہوئے اُسے اندر کیا۔

''کیوں؟''ایک تو اُسکے سوالات۔

''اندر بند ہو جاؤ گی تو دروازہ توڑوں گا کیا؟''ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

''اچھا اچھا۔''سمجھ کر سر ہلایا اور اندر چلی گئی۔پیچھے علی نے دروازہ تھوڑا سا کھلا چھوڑا اور واپس بستر پر آ کر ڈھیر ہوا۔دو منٹ گزرے،وہ باہر نہ آئی۔پھر پانچ منٹ اور جب دس منٹ گزر گئے تو وہ پریشان ہوتا دروازے پر آیا۔

''کیا کر رہی ہو تم اندر؟''دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے پوچھا۔

''ایک منٹ۔۔۔''اندر سے آواز آئی۔پھر اُس نے دروازہ کھول کر منہ باہر نکالا۔

''کیا کر رہی ہو اتنی دیر سے اندر؟''سر جھکا کے اُسے دیکھا۔

''پانی نہیں آرہا۔''اُس نے کہا۔

''ہیں؟''علی کو اُسکی بات سمجھ نہ آئی،پانی تو آرہا تھا۔

''ہٹو آگے سے۔''اُسے پیچھے ہٹاتے ہوئے دروازہ وا کرتے،اندر داخل ہوا۔اندر کے حالات دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے جنگ کر کے آرہی ہو۔شاور نیچے گرا ہوا تھا،ہینڈ واش زمین پر بہہ رہا تھا،اور بالٹی الٹی کر کے بیسن کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔

''یہ کیا ہے؟''واشروم کا یہ حال دیکھ کر اُسکا دماغ گھوما۔

''میرا ہاتھ نہیں جا رہا تھا۔''اُس نے بالٹی الٹی رکھنے کی وضاحت دی۔

''تو تم اس پر چڑھی تھی؟''اُس نے پوچھا تو جواباً اُس نے زور زور سے سر ہلایا جیسے بہت بہترین کارنامہ انجام دیا ہو۔ اُسے گھورتے ہوئے علی بیسن کے پاس آیا اور نلکا کھولا۔پانی پوری تیزی سے آرہا تھا۔نل واپس بند کر کے اُسے دیکھا۔

''آتو رہا ہے پانی۔''

''مجھ سے نل نہیں کھلا۔''اپنی غلطی کی خود ہی وضاحت دی۔اُس نے آگے بڑھ کر نل دوبارہ کھولا۔

''دھوہاتھ۔۔۔''وہ جلدی سے بالٹی پر چڑھی، علی نے ضبط سے اُسے دیکھا۔پھر اُس نے سکون سے ہاتھ دھوئے،دھوئے اور دھوتی ہی چلی گئی۔

''بس کردو! ہو گیا ہے۔''اُس نے چڑ کے نل بند کیا تو وہ نیچے اتری۔

''تولیہ؟''ملکہ عالیہ کو ہاتھ پونچھنے تھے۔اُس نے پاس لٹکا تولیہ اُسے دیا،اُس نے ہاتھ پونچھ کر واپس کیا اور باہر نکل گئی۔واشروم پر ایک آخری تاسف بھری نظریں ڈالتے لائٹ بند کی اور دروازہ لاک کرنے کے بجائے تھوڑا سا کھلا چھوڑ کے اپنے بستر پر آ گیا۔

''دروازہ کھلا ہے واشروم کا،دوبارہ جانا ہو تو میری نیند خراب مت کرنا۔''اُسے سمجھاتا ہوا وہ لیٹ گیا۔

''پر میں نل کیسے کھولوں گی؟''ایک اور مسئلہ۔

''جیسے میں نے کھولا تھا۔''

''میں نے دیکھا نہیں تھا۔''چہرے پر مسکینیت طاری کی۔

''سو جاؤ چپ کر کے۔''تنگ آ کر کہا اور کروٹ بدل لی۔

''بات سنیں!''اُس کی آواز دوبارہ آئی۔

''اب کیا ہے؟''وہ روہانسا ہو گیا۔کب سے سونا چاہتا تھا اور اس نے عجیب دھینگا مشتی لگا رکھی تھی۔

''پانی پینا ہے۔''

''کیوں؟''جھنجھلایا۔

''پیاس لگی ہے۔''یہ بھی کوئی سوال تھا پوچھنے والا، بھلا پانی کیوں پیتے ہیں؟

''یہ کونساوقت ہے پیاس لگنے کا؟''وہ اپنے لہجے پر قابو نہیں رکھ سکا۔یہ بچی اُسکے ضبط کا امتحان لے رہی تھی۔

''مجھے پیاس لگی ہے۔''اگلے ہی لمحے اُس نے رونا شروع کر دیا۔

''اب رو کیوں رہی ہو؟''

''آپ ڈانٹ رہے ہیں مجھے۔۔۔''روتے ہوئے ہی رونے کی ہی وجہ بیان کی۔

''یااللہ! مجھے صبر دے۔''اُس کا دل کر رہا تھا اپنے بال نوچ لے۔رات کے اس پہر وہ گلا پھاڑ کر رو رہی تھی۔

''دے رہا ہوں پانی چپ کر جاؤ تم۔''بس اتنی سی بات،اور میڈم کے سارے آنسو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب۔۔۔

وہ لب بھینچتا اٹھا اور آدھا گلاس پانی اُسے پکڑایا۔جیسے ہی اُس نے منہ سے لگانے کی کوشش کی یکایک علی کو ڈائننگ ٹیبل کا منظر یاد آیا۔اور اگلے ہی لمحے اُس نے گلاس اُسکے ہاتھوں سے واپس لیا۔

''رک جاؤ! میں پلا رہا ہوں تمہیں،ورنہ سارے کپڑے گیلے کر لو گی۔''اُسکے سوال کرنے سے پہلے ہی کہا اور گلاس اُسکے منہ سے لگایا۔ کچن میں اُسے پانی کے مقدار پر لیکچر دینے والی یہ چوزی اس وقت آدھا گلاس پانی غٹا غٹ پی گئی تھی۔

''اور۔۔''مزید پانی مانگا تو اس نے لب بھینچ کر مزید آدھا گلاس اُسے پلایا۔

''اور۔۔۔''

''بس۔۔۔''علی نے آنکھیں دکھائی''اتنا پانی پیو گی پھر کہو گی واشروم جانا ہے۔''اسکو ڈپٹتے ہوئے پانی کا جگ اور گلاس واپس رکھا۔

''اب سو جاؤ!اور خدا کے لیے خود بھی سوؤ اور مجھے بھی سونے دو۔''باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے تو وہ اچھے بچوں کی طرح سر ہلاتی لیٹ گئی۔ وہ بھی تھک کر اپنی جگہ آیا۔

''ایک بات بتائیں۔۔۔''

''چپ۔۔۔''وہ کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ علی نے گھرکا۔

''اوکے''جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بیچارہ بھی ایسا تھکا کہ دوبارہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا اور نیند کی وادیوں میں پہنچ گیا

---------+---------+--------

اندھیری رات میں وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔اُسکے پیچھے فیصل اور شیراز اور اُنکے بھی پیچھے،اُنکی پوری نفری تھی۔ہاتھوں میں پستول تھامے،جسکا رخ آسمان کی جانب تھا،وہ دیوار سے چپکتا چل رہا تھا۔دروازے کے برابر رک کر اُس نے پیچھے دیکھا۔فیصل پیچھے تھا،اُسے اشارہ کیا تو وہ آگے آیا۔پھر پنجوں کے بل دروازے کے لاک کے سامنے بیٹھا اور کچھ ہی لمحوں میں لاک کھول دیا،پر دروازہ نہ کھلا۔

''کیا ہوا؟''سرگوشی نما آواز میں اُس سے پوچھا۔

''کنڈی لگی ہے۔''اُس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے!۔۔۔''اُس نے رک کر کچھ دیر سوچا۔پھر شیراز کی جانب دیکھا۔

''تم آدھی ٹیم لے کر جاؤ،اور اطراف میں دیکھو اگر کوئی کھڑکی یا دروازہ کھلا ملے،میں فیصل کے ساتھ باقی ٹیم لیکر جاتا ہوں۔''نوید نے اُسے حکم دیا۔

''اوکے سر!''وہ باقی ٹیم کے ساتھ دوسری سمت چلا گیا۔اُسکے جانے کے بعد نوید بھی بقیہ ٹیم کے ساتھ قدموں سے بنا آواز کیے،آگے بڑھ رہا تھا۔کچھ دیر ٹٹولنے کے بعد اُسے ایک کھڑکی کھلی ملی۔

''میں اندر جاتا ہوں پہلے۔''فیصل نے آگے بڑھنا چاہا۔

''نہیں!میں اندر جا کر دیکھوں گا پہلے۔''اُس نے اُسے روک دیا۔پھر ایک ہی جست میں کھڑکی پر چڑھا۔وہ کسی لیونگ ایریا جیسے کمرے کی کھڑکی تھی،اندر صرف ایک زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔وہ بنا آواز پیدا کیے اندر کود گیا۔پھر کتابوں کے ایک ریک کے پیچھے اوٹ لیکر چھپا۔اگلے ہی لمحے اپنی پستول آگے کرتا تیزی سے باہر آیا،کمرہ خالی تھا۔

''سب کلیئر ہے، تم لوگ اندر آ سکتے ہو۔اوور!''اپنے ٹرانسیور میں کہتے وہ آگے بڑھا۔اس لیونگ روم نما کمرے میں مزید تین کمروں کے دروازے تھے، دو کھلے تھے اور ایک بند تھا۔اُسکی نگاہوں کا مرکز بند دروازہ تھا۔اُسکے پیچھے فیصل باقی نفری کے ساتھ کودا اور اُس تک آیا۔

''یقیناً اس کمرے میں کوئی ہے۔''اُس نے آہستہ آواز میں بتایا۔

''اس دروازے پر بھی کنڈی لگی ہوئی ہو تو؟''فیصل نے ممکنہ خدشہ ظاہر کیا۔

''پھر ہمارے پاس اسے توڑنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو گا۔البتہ اس سے پہلے ہمیں ایک بار پورے گھر کی تلاشی لینی ہے، کہیں کوئی اور نہ۔۔۔''اُسکی بات مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دوسری طرف کی کھڑکی پر کھٹکا ہوا۔نوید نے فوراً اپنی پستول کا رخ کھڑکی کی جانب کیا، نفری الرٹ ہو گئی۔اُسی لمحے کھڑکی کھلی، اور کوئی اندر کودا۔

''ہاتھ اوپر۔۔۔''نوید نے پستول کا رخ اُسکی جانب کیا۔

''میں ہوں سر!''شیراز نے گھبرا کر دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

''حد ہے۔۔۔''اُسے گھورتے ہوئے دوبارہ رخ دروازے کی جانب موڑا۔

''ہم یہاں انتظار کر رہے ہیں، تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں، فوراً پورے گھر کا جائزہ لیکر آؤ۔''اُس کے حکم پر فیصل اپنے ساتھ دو بندے لیے فوراً وہاں سے نکلا۔

''کیا آپکو اس کمرے پر شک ہے؟''شیراز نے پوچھا۔

''مجھے یقین ہے کہ مائیکل یہیں ہے۔''اُس نے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوتے کہا۔

''تم لاک دیکھو، اگر یہاں بھی کنڈی لگی ہو گی تو ہم دروازہ توڑ دیں گے۔''اُسکے حکم کے مطابق شیراز پنجوں کے بل بیٹھا لاک دیکھنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں فیصل بھی سارے گھر کا معائنہ کر آیا۔

''سر! سب کلیئر ہے۔پورا گھر خالی ہے۔''نوید نے اثبات میں سر ہلایا۔شیراز نے بھی کچھ ہی دیر میں لاک کھول لیا تھا۔

''میں اندر جاؤں گا۔ تم لوگ میرے پیچھے رہو۔'' دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر نوید نے پستول پر گرفت مضبوط کی۔ پھر انگلیوں سے تین کا اشارہ کیا، پھر دو اور پھر ایک کہتے ہی اُس نے لات مار کر دروازہ کھولا اور پستول سامنے کرتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

اُسکے قدم تھمے، اتنے عرصے میں پہلی بار اُسکے ہاتھ کانپے، آنکھیں حیرت سے وا ہوئیں۔ اُسکے پیچھے آنے والی نفری بھی ساکت کھڑی رہ گئی۔ پستول اٹھایا ہوا نوید کا ہاتھ پہلو میں جا گرا۔

مائیکل عرف فرمان کمرے میں موجود تھا۔ اپنے پورے وجود کے ساتھ وہ انکی نظروں کے سامنے تھا۔

---------+---------+--------

آج کی صبح بڑی چمکیلی تھی، دھوپ میں گزشتہ دنوں کے مقابلے میں تیزی آگئی تھی، گرم کپڑے اور چادریں اب اندر جانے کی تیاریاں پکڑ چکی تھیں۔ کچن میں آنے سے پہلے اس نے ایک نظر اُس چھوٹے طوفان پر ڈالی تھی، جو رات بھر اُسکی نیند خراب کر کے اب مست پڑی سو رہی تھی۔ اُسے سوتا چھوڑ کر وہ ناشتہ بنانے کچن میں چلا آیا۔ سفیر صاحب بھی وہیں آگئے، ہمیشہ کی طرح دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔

فریج سے مایونیز باہر نکال کر رکھا، پھر ڈبل روٹی کے کنارے کاٹ کر اُسے ایک ڈبے میں رکھ دیا۔ اب وہ چھری کی مدد سے مایونیز ڈبل روٹی پر لگا رہا تھا۔ مگن سے انداز میں کام کرتے اُسکی توجہ صرف اور صرف ڈبل روٹی پر ہی تھی۔ سینڈوچ مکمل ہوا تو اس نے اُسے پلیٹ میں رکھا اور تب ہی بلکل اچانک سے اُسکی نظریں کاؤنٹر پر نمودار ہوتے دو ننھے ننھے ہاتھوں پر گئی۔ قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے چہرہ وہاں تک نہیں پہنچ سکا، علی نے جھک کر اُسے دیکھا۔

''کیا کر رہی ہو؟'' اُس نے پوچھا۔ سفیر صاحب نے اخبار کا کنارا موڑ کے اُنہیں دیکھا۔

''بھوک لگی ہے۔'' کاؤنٹر کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش میں ناکام ہوتے، علی کو جواب دیا۔

''برش کیا ہے؟'' پتہ نہیں اُس نے کیوں پوچھا؟ اُس نے جواب نہ دیا بلکہ کسی طرح اچھل کر کرسی پر جا بیٹھی۔

''کیا پوچھا ہے میں نے؟'' وہ بیزار ہوا۔

''کیا پوچھا ہے؟'' اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

''دانت صاف کیے ہیں یا نہیں؟''اُسکے چہرے پر غصّے کے اثرات نظر آنے لگے۔

''نہیں!''نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟''

''بھول گئی تھیں۔''

''پہلے دانت صاف کر کے آؤ، پھر ناشتہ ملے گ۔ا''اُس نے دوسرا سینڈوچ تیار کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں جانا۔''وہ بضد ہوئی۔

''میں کیوں اتنی بحث کر رہا ہوں اس سے؟''بڑبڑاتے ہوئے سینڈوچ کی پلیٹ اسکے آگے رکھ دی۔

''مجھے نہیں کھانا یہ۔۔''علی کا منہ تک سینڈوچ لے جاتا ہاتھ رکا۔

''کیوں؟''آبرو اچکا کر پوچھا۔

''میں ناشتے میں آملیٹ کھاتی ہوں۔''خوش ہوتے ہوئے بتایا۔

''تو میں کیا کروں؟''اُس نے پوچھا۔

''مجھے آملیٹ بنا کے۔''اس حکم پر جہاں وہ حیران ہوا تھا، وہیں سفیر صاحب نے اخبار دوبارہ منہ کے آگے کر لیا۔

''کیوں؟''ضبط سے پوچھا، دل تو کر رہا تھا کہ کہہ دے کیا میں تمہارا نوکر ہوں؟

''کیونکہ مجھے آملیٹ کھانا ہے۔''اب کہ وہ جھنجھلائی۔اس آدمی کو ہر بات اتنی مرتبہ کیوں سمجھانی پڑتی تھی؟

''مجھے آملیٹ بنانا نہیں آتا۔'' اب کہ اُس نے تحمل سے کہا۔

''آپ کو آملیٹ بنانا نہیں آتا؟''وہ حیران ہوئی۔''آپ تو اتنے بڑے ہیں؟''آنکھیں بڑی کر کے پوچھا۔ جیسے فقط یہ ایک کام نہ آنے سے علی کی تمام صلاحیتیں بیکار چلی گئیں ہوں۔

''تمہیں آتا ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''نہیں!'' نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟''

''میں تو چھوٹی ہوں ناں!'' وضاحت دی۔

''دیکھو! مجھے آملیٹ بنانا نہیں آتا، اب تم یہی سینڈوچ کھاؤ۔'' اب کہ اُس نے ذرا سختی سے کہا۔

''میں نہیں کھاؤں گی، مجھے آملیٹ ہی چاہیے۔'' وہ بپھر گئی۔

''مجھے غصّہ مت دلاؤ، کھانا ہے تو کھاؤ ورنہ بھوکی رہو۔'' اُس بار اُس نے غصّے سے ڈانٹا۔ اُسکا چہرہ لال ہوا، پھر آنکھیں سرخ ہوئی اور اگلے ہی لمحے پورے گھر میں اُسکا باجا بجنا شروع ہو چکا تھا۔

''اف۔۔'' علی نے دونوں ہاتھوں میں سر گرالیا۔

''مجھے نہیں آتا ناں آملیٹ بنانا، میں کیا کروں؟'' اُس نے بیچارگی سے پوچھتے ہوئے سفیر صاحب کو دیکھا۔ اُنہوں نے کندھے اچکا دیے، جیسے کہہ رہے ہوں کہ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟

''یوٹیوب سے دیکھیں۔'' رونے کے درمیان تجویز پیش کی۔

''تم ہر بات پر رونا کیوں شروع کر دیتی ہو؟'' وہ عجیب بے بسی کا شکار تھا۔

''آپ ہر بات پر ڈانٹتے کیوں ہیں؟'' سوں سوں کرتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو! اگر تم ابھی سینڈوچ کھالوگی، تو میں وعدہ کرتا ہوں دوپہر میں تمہاری پسند کا لنچ تمہیں ملے گا۔'' اتنی دیر میں پہلی بار اُس نے نشمیہ کو بچوں کی طرح پچکارا تھا۔

''آملیٹ تو آپکو بنانا نہیں آتا، لنچ کیسے بنائیں گے؟'' بھنویں چڑھا کر ناراضگی سے کہتی وہ سفیر صاحب اور علی دونوں کو بھونچکا کر گئی۔

''زبان دیکھیں ذرا اسکی۔''اُسے تو یقین ہی نہیں آیا۔ سفیر صاحب نے مسکراہٹ ضبط کی، پس ثابت ہو گیا کہ اُس سے بچوں کی طرح بات کرنے کا فائدہ نہ تھا۔

''کھالو اسے، لنچ باہر سے منگوا دوں گا۔''علی نے ایک آخری کوشش کی، صد شکر کہ اس بار وہ مان گئی۔اب آنسو پونچھتی، برے برے منہ بناتی سینڈوچ کھا رہی تھی۔

''ناشتہ جلدی ختم کرو، پھر ہم نے کہیں جانا ہے۔''ناشتہ مکمل کر کے اپنی کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے علی نے اُسے مخاطب کیا۔

''ہم کہاں جائینگے؟''اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بس! جانا ہے کہیں۔''وہ لاؤنج میں آ کھڑا ہوا۔ نشمیہ بھی اُسکے پیچھے پیچھے آئی۔

''کیا ہم اسکول جا رہے ہیں؟''اُس نے پوچھا۔

''اسکول؟ تم اسکول جاتی ہو؟''علی نے رک کر اُسے دیکھا۔

''ہاں!''زور و شور سے سر ہلایا۔

''نہیں ہم وہاں نہیں جا رہے۔''

''لیکن مجھے تو اسکول جانا ہے، مجھے ٹیچر کو آج پویم (نظم) سنانی ہے۔''اُس نے ایک بار پھر ضد کی۔ علی نے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے، تیوری پر بل چڑھائے، بھنویں اچکائیں اور جھک کے اُسے دیکھا۔

''تم اسکول نہیں جا رہی۔''اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

چھوٹی چوزی نے دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے، بھنویں چڑھائیں اور سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''مجھے جانا ہے۔''اُس نے بھی اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔

''کہاناں! نہیں جانا۔۔''علی نے ڈپٹا۔اور بس! اُسکا رونا شروع۔

''یارب! صبر دے مجھے۔۔۔صبر دے۔''وہ ٹھیک ٹھاک کوفت کا شکار ہوا۔وہ غصّہ کرتا تھا تو وہ اُس سے زیادہ غصّہ کرتی تھی،وہ ڈانٹتا تھا تو محترمہ رونا شروع کر دیتی تھیں۔

''مجھے کیا معلوم تم کون سے اسکول میں پڑھتی ہو؟''وہ ایک بار پھر جھنجھلایا۔

''مجھے نہیں پتہ،مجھے اسکول جانا ہے۔ورنہ ٹیچر مجھے ڈانٹیں گی۔''وہ روتی رہی۔

''اسکول کا بیگ ہے؟''ناچار وہ راضی ہوا۔

''ہاں!''جلدی سے سر ہلایا۔

''لیکر آؤ۔''وہ بھاگ کر گئی اور چند منٹ میں ہی بیگ لے آئی۔ علی نے اُسکا بیگ دیکھا تو،کتاب کے نام پر سوائے ایک ڈائری کے اور کچھ نہ تھا۔اُس نے آئی ڈی کارڈ نکال کر اسکول کا نام دیکھا۔گھر سے قریب ہی تھا،اوقات دس سے بارہ بجے تھے،اور ابھی سوا نو ہو رہے تھے۔

''کتابیں کہاں ہیں؟''

''ٹیچر کے پاس۔''

''صرف دو گھنٹے کیلئے اسکول جاتی ہو؟''علی کو اسکول کے اوقات دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔

''وہ کیا ہوتا ہے؟''بھلا اُسے گھنٹوں کا کیا معلوم؟اُسے تو بس یوٹیوب معلوم تھا۔

''چھوٹے بچوں کے یہی اوقات کار ہوتے ہیں۔''اس بار سفیر صاحب نے جواب دیا تھا۔

''یونیفارم ہے؟''علی نے پوچھا۔

''وہ بڑے والے بیگ میں ہے۔''اُس نے اپنے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔

''جا کر نکالو،اور جلدی تیار ہو کر آؤ۔''اُسے حکم دیتا وہ صوفے پر جا بیٹھا۔

''کیسے نکالوں؟مجھ سے بیگ نہیں کھلتا۔''ایک اور مسئلہ بیان کیا۔

''رات کو کیسے نکالے تھے؟''وہ بھی چار سال کی بچی سے برابری سے لڑ رہا تھا۔

''وہ تو ابّا نے نکال کر دیئے تھے۔''اُس نے سفیر صاحب کی طرف اشارہ کیا،اُن دونوں کا قہقہہ بیساختہ تھا۔اُسکا سفیر صاحب کو ابّا کہنا اُنہیں مزادے گیا،اور اس گھر کے در و دیوار نے ایک لمبے عرصے بعد دونوں باپ بیٹے کو اس طرح ہنستے ہوئے سنا تھا۔

''کیا ہوا؟''اُس بیچاری کو ہنسنے کی وجہ سمجھ نہ آئی۔

''کچھ نہیں! تم اپنے ابّا سے ہی یونیفارم نکلواؤ اور جلدی تیار ہو کر آؤ۔میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا۔''

''اوکے!''وہ بھاگتے ہوئے بیگ کے پاس گئی۔سفیر صاحب بھی اُسکے پیچھے ساتھ گئے۔

پورے پندرہ منٹ بعد وہ یونیفارم پہنے اُسکے سامنے تھی،بالوں کو جیسے تیسے کر کے کلپ لگا دی تھی۔

''آپ نے رات کو اسے کپڑے نکال کر دیے تھے؟''اُس نے سفیر صاحب کو مخاطب کیا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو جب یہ کھانے کے انتظار میں کچن میں تھی،تب آپ کہاں تھے؟''اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید میں نماز پڑھ رہا تھا۔''اُنہوں مختصراً جواب دیا۔

''ہمم۔۔۔''وہ سر ہلاتے باہر آیا۔اُسکا سامان گاڑی میں رکھا اور خود اسکو بھی۔سیٹ بیلٹ لگانے کی کوشش کی مگر محترمہ نے کھول دی۔وہ سر جھٹک کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔سارے راستے وہ کبھی سیٹ پر کھڑی ہو جاتی،کبھی بیٹھ جاتی،کبھی ڈیش بورڈ پر رکھی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھتی۔علی کو نہیں یاد کہ کبھی احمد نے اُسے اتنا تنگ کیا ہو،پتہ نہیں کیوں وہ بار بار احمد سے اُسکا موازنہ کرنے لگتا تھا؟

''اُترو!''اسکول کے سامنے گاڑی روکی اور اُتر کر اُسکی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔وہ اُتر گئی،پھر علی نے اُسکا بیگ اُسکے حوالے کیا۔

''آپ کون ہیں؟''دروازے پر کھڑا گارڈ علی کو دیکھ کر حیران ہوا۔

''میں؟''اُسے سمجھ نہیں آیا کہ کیا تعارف دے اپنا۔

''نشمیہ کو تو اُسکی والدہ ہمیشہ چھوڑنے آتی ہیں۔آپ کون ہیں؟''

''میں دراصل۔۔۔''

''یہ میرے باباہیں۔''اُس سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔وہ جہاں تھا،وہیں کھڑا رہ گیا۔کتنے سکون سے اُس نے علی کا تعارف اپنے باپ کے طور پر کروایا تھا؟اُسکے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

''اوہ اچھا اچھا۔۔۔تو واپسی پر بھی آپ ہی آئیں گے ؟''گارڈ نے پوچھا تو علی نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔وہ مطمئن ہوتا پیچھے ہٹ گیا۔

''بات سنو بچی!''گارڈ کے جانے کے بعد علی نے اُسکی طرف جھکتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

''نشمیہ نام ہے میرا۔''اُسے باور کروایا۔

''جو بھی ہو۔''اُس نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔''میں واپسی پر آؤں گا،اور تمہیں لیکر کہیں جاؤں گا۔مجھے کسی قسم کی کوئی ضد نہیں چاہیے۔اوکے ؟''اُسے بھلا کہاں کچھ سمجھ آئی تھی۔جلدی جلدی سر ہلا کر اُسے یقین دلایا کہ کوئی ضد نہیں کریگی،اور فوراً اندر بھاگ گئی۔

وہ اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

---------+--------+-------

اُمید تو تھی کہ وہ اُسکے شادی پر نہ آنے پر ناراض ہو گی،لیکن جب اُس نے بھرپور خوش اخلاقی سے اُسکا استقبال کیا تو وہ حیران رہ گیا۔

''آج تو تم بڑے اچھے وقت پر آئے ہو،میں نے لزانیہ بنایا ہے،کھا کر جانا۔''مقدّس نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''اگر تم نے بنایا ہے تو ضرور کھاؤں گا۔''مسکراتے ہوئے کہتا وہ صوفے پر بیٹھا اور مکرم کو گود سے اتار کر اپنے برابر میں بٹھا دیا۔

''تمہیں پتہ ہے،تمہارے لڑکے نے تو میری ناک کٹوا دی شادی پر،جہاں کوئی لڑکی دیکھتا،اچھل اچھل کر اُسکی گود میں جانے کی ضد کرنے لگتا،اور جیسے ہی کوئی لڑکا اپنے پاس بلا لیتا،موصوف ایسا رونا شروع کرتے جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔بہت دل پھینک ہے یہ۔''میز پر سامان لگاتی وہ مزے سے بتا رہی تھی۔

''ہاں بھئی ؟ایسا کیا تھا تم نے ؟''اُس نے اپنے برابر میں ٹکے مکرم کو دوبارہ گود میں اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

''اور نہیں تو کیا؟ ابھی سے نظر رکھو اس پر، بہت رنگین مزاج ہے یہ۔'' وہ بس مسکرا دیا۔

''لو! کھا کر بتاؤ کیسا لگا؟'' گرم گرم لزانیہ کی پلیٹ اسکے حوالے کی۔ اُس نے پلیٹ لی۔ صورت تو اچھی ہی نظر آ رہی تھی۔

''میں کیا سوچ رہی ہوں کہ کیوں نہ مکرم کو سامنے والے پارک لے جاؤں؟ بہت سے بچے آتے ہیں کھیلنے، سارا دن میرا منہ دیکھ دیکھ کر بور ہو گیا ہے بیچارہ، اچھا ہے اپنی عمر کے بچوں میں بھی کھیل لے گ''

''ٹھیک ہے۔'' اُس نے مختصر جواب دیا۔

''کیا بات ہے مقدّم؟ تم پریشان ہو؟'' اُس نے یکدم ہی سنجیدگی سے پوچھا تو وہ ٹھہر گیا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر اتنا چپ چپ کیوں ہو؟'' وہ اُسکی خاموشی کو نوٹ کر رہی تھی۔

''میں بس سوچ رہا تھا کہ۔۔۔'' وہ رکا اور جانچتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

''کہ؟''

''تمہیں تو مجھ سے ناراض نہیں ہونا چاہیے تھا؟''

''کس بات پر؟'' وہ حیران ہوئی۔

''تمہارے مدعو کرنے پر بھی میں شادی میں نہیں آ سکا۔''

''میں نے شکایت کی؟'' آنکھوں میں نرمی لیے سوال کرتی وہ اُسے حیران کر گئی۔

''نہیں! لیکن میں نے تو غیر اخلاقی حرکت کی ناں۔''

''تم مجھے اپنے نہ آنے کی وجہ بتا چکے تھے۔ پھر غیر اخلاقی حرکت کیسے ہوئی؟'' اُسکے کھاتے سے سارے قصور نکال دیے۔

''آئی ایم سوری۔'' اُسکے دل کو تسلی نہ ہوئی۔

''اچھا کیا تم نہیں آئے، پورا خاندان آیا تھا۔'' وہ معافی مانگتا اچھا نہ لگا۔

''کیوں؟ پورے خاندان نے میرے بارے میں کچھ کہا کیا؟'' اُس نے خالی پلیٹ واپس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بس ویسے ہی کہہ رہی تھی۔'' وہ گڑبڑائی۔

''میں سمجھ گیا۔'' وہ اُداسی سے مسکرا دیا۔ مقدّس کو افسوس ہوا، کیا ضرورت تھی بتانے کی؟

''ایک بات پوچھوں؟'' اُس نے مقدّم کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!'' اُس نے اجازت دی۔

''اگر میں سچ میں ناراض ہوتی تو؟''

''تو؟'' وہ سمجھ نہیں سکا۔

''تو؟'' بھنویں اچکا کر پوچھا، سوال میں نے کیا ہے جواب تم دو۔

''تو کیا؟ معافی مانگ لیتا۔''

''کیوں؟'' اس سوال پر وہ رک گیا۔

''کیوں؟'' خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''معلوم نہیں!'' کندھے اچکا کر کہا تو وہ مسکرائی۔

''میری ناراضگی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ پلیٹ سمیٹتے کہنے لگی۔

''ضرورت ہے۔'' اُسکی زبان سے بے ساختہ پھسلا۔

''کیوں؟'' اب کہ حیرت سے آنکھیں وا کیے پوچھا۔

''کیونکہ۔۔۔۔'' اس کیوں کا جواب تو اُسکے پاس بھی نہیں تھا۔

''کیونکہ میں تمہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا۔''آہستگی سے کہا تو مقدّس کی آنکھیں مسکرا اٹھیں۔

''کیوں؟''مسکراتی آنکھوں سے پوچھا۔

''تمہارا کوٹہ پورا ہو گیا۔''لمحوں میں فسوں ٹوٹا۔

''ہیں؟''فوری طور پر وہ سمجھ نہ سکی۔

''کوٹہ پورا ہو گیا باقی سوال کل۔''وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''تم ابھی بھی اُس فضول سے گیم کو کھیل رہے ہو؟''وہ چڑ گئی۔اپنا سوال ادھورا رہ جانے کا دکھ الگ تھا۔

''گیم نہیں! کوٹہ۔۔۔''اُسے باور کراتے دروازے تک آیا۔

''ہونہہ۔۔۔آئندہ میں بھی ایسے ہی کروں گی۔''اُسکے پیچھے آتی،وہ سچ میں ناراض ہو گئی۔

''لیکن میں تو سوال کرتا ہی نہیں۔''چہرے پر ڈھیروں معصومیت سجا کر کہا۔

''جاؤ جلدی! مجھے دروازہ بھی بند کرنا ہے۔''اُسے دروازے پر ٹکا دیکھ،لٹھ مار انداز میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے،لیکن کیا اس بار میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟''مزید معصومیت سے اُسے دیکھا۔

''نہیں!''اُس نے آنکھیں دکھاتے ہوئے دروازہ کھولا اور باہر کی طرف اشارہ کیا۔

''صرف ایک۔۔''مسکراتے ہوئے درخواست کی۔

''پوچھو!''پھر سے لٹھ مار انداز میں کہا۔

''تم اتنا ناراض کس بات پر ہو رہی ہو؟سوال ہی تو تھا۔ا''اس سوال پر وہ ساکت سی رہ گئی۔

''اوکے! بعد میں ملتے ہیں۔''وہ مسکراہٹ ضبط کرتا باہر نکل گیا۔وہ ویسے ہی کھڑی رہی،اس بات کا تو واقعی کوئی جواب نہ تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھتے ایک نظر اُسے دیکھا پھر سر تک ہاتھ لیجا کر اُسے سلام کہا اور گاڑی سٹارٹ کر کے چلا گیا۔

''بد تمیز!''ہمیشہ کی طرح اُسے خطاب دیتی، پیر پٹختی اندر چلی گئی۔

---------+---------+--------

کل رات بھر اُنہوں نے سائٹ پر کام کیا تھا، لہٰذا آج سارے آفس کو چھٹی دی تھی۔اسی لیے عمر بھی آج آفس میں نہ تھا۔وہ نشمیہ کو اسکول چھوڑ کر آفس ہی چلا آیا،اب خالی آفس میں اکیلے بیٹھے، کسی کاروباری میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔گھڑی صبح کے سوا دس بجا رہی تھی، اُس نے موبائل پر پونے بارہ بجے کا الارم سیٹ کیا کہ کہیں نشمیہ کو اسکول سے لینا نہ بھول جائے۔میگزین کے صفحے پلٹتے ایک جگہ آکر اُسکے ہاتھ تھم گئے۔آنکھوں میں امڈتی حیرت کے ساتھ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

آغا مقدّم شفیق کا انٹرویو چھپا تھا، صفحے پر اُسکی معتدد تصاویر تھیں۔کہیں وہ اپنے آفس میں بیٹھا میزبان کے سوالات کے جوابات دیتا نظر آرہا تھا، کہیں اپنی ٹیم کے ساتھ ''بزنس آف دی ایئر''کا ایوارڈ لیے کھڑا تھا۔درمیان میں اُسکا انٹرویو موجود تھا۔یہ انٹرویو اُسکے کاروبار کو مسلسل تیسری بار ایوارڈ ملنے پر لیا گیا تھا۔

علی کو ایک انجانی سے خوشی محسوس ہوئی،ایک عجیب سا فخر۔۔۔

وہ دلچسپی سے اُسکا انٹرویو پڑھنے لگا،کاروبار کے حوالے سے اُسکا مشاہدہ،اُسکا تجربہ نہ صرف قابلِ ستائش تھے، بلکہ کافی کارآمد بھی تھے۔علی کو نہیں یاد کہ اُس نے کبھی کسی کاروباری شخصیت کا انٹرویو اتنی دلجمعی سے پڑھا ہو۔تقریباً تمام سوالات اُسکی جدوجہد،کاروباری سمجھ بوجھ اور اُسکی فرم کے حوالے سے تھے۔آخر میں چند دوستانہ سے سوالات اُسکی ذاتی زندگی کے حوالے سے بھی تھے۔

''آپ نے بزنس کی دنیا میں تو بڑا نام کما ہی لیا ہے، لیکن یہ بتائیے کہ ذاتی زندگی میں مقدّم کیسا ہے؟ایسا ہی سنجیدہ سا یا ہنس مکھ اور شرارتی سا۔''میزبان نے سوال کیا تھا۔

''شرارتیں کرنے کی اب عمر تو نہیں ہے بلکل بھی،البتہ ورک لائف (کاروباری زندگی)اور پرسنل لائف (ذاتی زندگی)میں فرق تو ہوتا ہی ہے۔''اس نے بڑا نپا تلا جواب دیا تھا۔

''تو آپ شادی شدہ ہیں؟''میزبان کا دوسرا سوال۔

''نہیں۔۔''

(لیلیٰ مر چکی ہے علی!۔۔۔)

''تو زندگی میں کوئی ہے؟ یا ورک لائف (کاروباری زندگی) نے اس طرف سوچنے کا موقع نہ دیا۔''میزبان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ اس جواب پر مقدّم مسکرایا، میگزین میں تو یہی لکھا تھا۔ لیکن علی کو یقین نہیں تھا کہ وہ مسکرایا ہوگا۔

(لیلیٰ مر گئی تھی، اور میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا، جب تک ہوش آیا تب تک اُسکا سوئم بھی گزر چکا تھا)

''فلحال تو ایسا کچھ نہیں ہے، میرا سارا وقت فرم کی کامیابی کے لیے، مزید بہترین سے بہترین اسٹریٹیجیز پر کام کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ ابھی تو ہم نے بہت آگے جانا ہے۔ لہٰذا اسکے علاوہ اور کچھ بھی سوچنے کا وقت نہیں ہے۔''

(اُسکے بعد جتنی دوائیں مجھے ڈاکٹرز نے دی تھیں، وہ اتنی بھاری تھیں کہ میں چوبیس گھنٹوں میں سے چند گھنٹے جاگتا تھا باقی کے گھنٹوں میں چاہ کر بھی ہل نہیں سکتا تھا۔ چلنے کے لیے قدم رکھتا تھا تو پاؤں لڑکھڑاتے تھے، بات کرتا تھا تو زبان ہکلاتی تھی۔)

مقدّم کا جواب اُس میزبان کے لیے تو عام سا ہوگا، لیکن علی جیسا انسان جو اُسے قریب سے جانتا تھا۔ اُسکے لیے یہ جواب عام نہ تھا۔ اس جواب میں پوشیدہ گہرائی میں وہ باآسانی اُتر رہا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو مصروف کر لیا تھا، وہ اپنا سارا وقت کاروبار کی ترقی میں نہیں، ماضی کی یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے لگا رہا تھا۔ اس سے زیادہ اُس سے نہ پڑھا گیا۔ اُس نے رسالہ بند کر دیا، پھر جیب سے سگریٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے جلا کر منہ سے لگائی اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

کیا ہوا تھا لیلیٰ کو؟ ایسے اچانک کیسے مر گئی؟ اچانک مری یا کچھ اور؟ اُس نے اس ایک انسان کا والہانہ پن دیکھا تھا۔ ایک دور میں وہ دیوانوں کی سی محبت رکھتا تھا لیلیٰ سے، لگتا تھا کہ اگر وہ نہ ملی تو سچ میں مر جائیگا۔ اور آج؟ آج وہ زندہ تھا۔ زندگی نہیں رکتی کسی کے لیے، اُسکی بھی نہیں رکی تھی۔ خود علی بھی تو یہی سمجھتا تھا کہ وہ فاطمہ کے بغیر مر جائیگا۔ لیکن وہ زندہ تھا، فاطمہ تو کیا احمد بھی جا چکا تھا لیکن زندگی تب بھی چل رہی تھی۔ زندگی نہیں رکتی۔۔۔ کسی کے لیے نہیں رکتی۔۔۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ تین سگریٹ پی گیا تھا۔ کمرہ سارا دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

اُسکا موبائل بج اٹھا تو وہ چونکا، الارم چیخ چیخ کر پونے بارہ کا وقت بجا رہا تھا۔ اُس نے الارم بند کیا اور اپنا سامان لیکر اُٹھ کھڑا ہوا۔

زندگی نہیں رکتی۔۔۔۔

اُسکی بھی نہیں رکی تھی۔۔۔

---------+---------+--------

''وہ بچی میرے ساتھ آئی تھی ناں صبح؟''اسکول کے دروازے پر کھڑا وہ گارڈ کو بتا رہا تھا۔

''جی جی! مجھے یاد ہے، نشمیہ کی بات کر رہے ہیں آپ۔''وہ سمجھ کر سر ہلاتا واپس اسکول کے دروازے پر گیا۔ علی اب تک نشمیہ کو اُسکے نام سے مخاطب نہیں کر سکا تھا۔

''مس! نشمیہ علی کو بھیج دیں''گارڈ نے ٹیچر کو مخاطب کیا تو وہ ششدر کھڑا رہ گیا۔ نشمیہ علی؟اُسکا نام نشمیہ علی تھا؟فاطمہ نے یہ کیوں کیا تھا؟کس لیے؟تین سال اُسکے دوسرے شوہر کے ساتھ رہ کر بھی وہ بچی اُسے باپ کیوں کہہ رہی تھی؟علی کا خون کھولنے لگا پر اُس نے ضبط کیا۔کچھ ہی دیر میں وہ اچھلتی کودتی اُسکے سامنے آئی۔

''میں آگئی۔''آتے ساتھ ہی اپنے آنے کی اطلاع بھی دے دی۔ علی نے بنا کچھ کہے دروازہ کھولا اور اُسے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میرا بیگ؟''بھلا بیگ کے ساتھ کیسے اندر بیٹھوں؟اُس نے بیزار سی شکل بنا کر اُسکا بیگ اُتارا۔وہ چڑھ کر اندر بیٹھ گئی۔اُس نے اُسکا بیگ پیچھے والی سیٹ پر رکھ دیا۔ پھر گھوم کر اپنی طرف آ بیٹھا۔

اب اسکا رخ بلڈ ٹیسٹنگ لیب کی جانب تھا۔شہر کی مشہور و معروف لیب کے آگے گاڑی روک کر اُس نے نشمیہ کو اتارا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟''اُسکا پہلا سوال۔

''ہے ایک جگہ، تم بس چپ کر کے اندر چلو۔''اُسے اپنے ساتھ لیکر اندر آیا اور انتظار گاہ میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بٹھا دیا۔

''السلام علیکم!''کاؤنٹر پر بیٹھے لڑکے کو مخاطب کیا۔

''وعلیکم السلام! کیا مدد کر سکتے ہیں آپکی؟''اُس نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

''مجھے ڈی این اے، فیٹر نٹی ٹیسٹ کروانا ہے۔''اُس نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

''اور بچہ ؟''اُس نے پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا۔

''یہ بچی ہے۔''پیچھے مڑ کر اشارہ کیا اور دھک سے رہ گیا۔ نشمیہ وہاں نہیں تھی۔

''یہ کہاں گئی؟''پریشانی سے یہاں وہاں دیکھا، وہ قریب رکھے ایکویریم کے پاس کھڑی نظر آئی تو اُس نے سکون کا سانس خارج کیا، پھر غصّے سے اُسکے پاس آیا۔

''میں نے تمہیں وہاں بٹھایا تھا نہ ؟''اُسکے سر پر جا کے پوچھا۔

''یہ دیکھیں، کتنی ساری فش (مچھلی) ہیں ؟''اُس نے پر جوش ہوتے ہوئے کہا۔ وہ کیسے بھول گیا تھا کہ وہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے والی مخلوق نہیں تھی۔ اُسے بازو سے پکڑ کر کاؤنٹر تک لایا۔

''یہ ہے بچی۔۔۔''

''ٹھیک ہے ! آپ اندر آجائیں۔''وہ اُسے لیے اندر گیا۔ جہاں ٹیسٹ کے لیے نمونے لیے جاتے تھے۔

''آپ ڈاکٹر ہیں ؟''وہ اپنی آستین بازو تک پیچھے کر رہا تھا تاکہ خون دے سکے، پاس کھڑا اسسٹنٹ تمام چیزیں سیٹ کر کے رکھ رہا تھا، جب نشمیہ نے اُسکے سفید اوورال کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ ایسا ہی سمجھ لیں۔''اسسٹنٹ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہم ہاسپٹل آئے ہیں ؟''دوسرا سوال علی کے لیے تھا۔

''کیا تم کچھ دیر کے لیے خاموش رہ سکتی ہو ؟''اُس نے پوچھا

''نہ۔۔''نفی میں سر ہلایا تو علی نے اپنا غصّہ جبکہ اسسٹنٹ نے اپنی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔ علی کے نمونے لینے کے بعد اُسکی باری آئی۔ انجکشن کی سوئی دیکھ کر ہی اُس نے وہ وبال مچایا کہ بیچارہ اسسٹنٹ بھی گھبرا گیا۔

''ایسا کرتے ہیں، ہم اُسکے لعاب کے نمونے لے لیتے ہیں۔ وہ زیادہ آسان ہو گا۔''اسسٹنٹ نے حل پیش کیا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ وہ بھی کرنے دے گی۔''علی نے بے چارگی سے کہا۔

''نشمیہ! پیاری سی گڑیا!''اسسٹنٹ نے اُسے پیار سے مخاطب کیا تو پیاری سی گڑیا سرخ ہو گئی۔

''آپ لولی پاپ کھائیں گی؟''اُس نے فوراً سے سر ہلایا۔ بھلا لولی پاپ بھی کوئی منع کرنے والی شے تھی؟

''چلو پھر آنکھیں بند کر کے منہ کھولو۔''اسسٹنٹ نے کہا۔

''میں آنکھیں نہیں بند کروں گی۔''وہ ایک بار پھر بَھپر گئی۔

''کیوں؟''

''آپ آنکھیں بند کر کے سوئی لگا دیں گے۔''اسسٹنٹ تو حیران ہی رہ گیا۔ علی فرصت سے سینے پر ہاتھ باندھے اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھگت لیا، اب تمہاری باری۔۔۔

''اچھا! آنکھیں بند نہ کرو، ایسے ہی منہ کھول لو۔''اُس نے حل پیش کیا، اس پر وہ راضی ہو گئی۔

''آں۔۔۔''اُس نے بڑا سا منہ کھولا تو پہلے اسسٹنٹ نے جلدی سے ایک اسٹیک نما چیز پر روئی لگا کر اُسکے منہ میں ڈالی اور اُسکا لعاب لے لیا۔

''لولی پاپ؟''چوزی کو اُسکا کھانا نہیں ملا۔ اس سے پہلے کو وہ مزید وبال کھڑا کرتی، اسسٹنٹ نے اُسے واقعی لولی پاپ پکڑا دی۔

''یہ رپورٹ کتنے دنوں میں آجائے گی؟''ساری کاروائی مکمل ہونے کے بعد علی نے اس سے پوچھا۔

''سر! سات سے دس دن۔۔۔''

''یہ تو بہت زیادہ ہیں، کیا مجھے کل پرسوں میں نہیں مل سکتی؟''

''آپ ارجنٹ چاہتے ہیں تو بھی تین دن لگیں گے۔ اُس سے کم نہیں۔۔۔''

''ٹھیک ہے! ارجنٹ کر دیں۔''اُس نے نقد رقم جمع کرواتے ہوئے کہا، پھر باہر آ گیا۔

گاڑی سٹارٹ کرنے سے پہلے اُسکا موبائل بجا۔اُس نے سکرین کھولی تو واٹس ایپ چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ کسی نے گروپ بنایا ہے اور اُسے بھی اُس گروپ میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اُسکے علاوہ پانچ میمبر تھے اُس گروپ کے ،ایک تو عمر کا نمبر تھا،، باقی چاروں نمبر اُسکے پاس محفوظ نہ تھے البتہ پروفائل پر سب کے نام واضح تھے، گروپ ایڈمن کی پروفائل پر نوید عالم کا نام لکھا تھا۔وہ حیران ہوا، نوید کا نمبر پچھلے دنوں عمر نے اُسے بھیجا تھا، اُس نے محفوظ کر لیا تھا پر بات نہ ہو سکی۔پر اب جس نمبر سے گروپ بنایا گیا تھا یہ وہ نہ تھا۔ گروپ کا نام **مائیکل کیس** تھا۔اس سے پہلے کہ وہ اس گروپ کا مقصد سمجھتا، وہاں نوید کا ایک تصویری پیغام موصول ہوا۔

اُس نے تصویر کھولی، ایک مردہ شخص، جسکے سر سے خون بہہ رہا تھا اپنے پلنگ پر پڑا ہوا نظر آیا۔ لیکن اُسکے ہوش نیچے لکھے میسیج نے اڑائے تھے۔

''مائیکل مر چکا ہے''

---------+--------+-------

(جاری ہے)

نحل کی دسویں قسط اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو میری ویبسائٹ اور پیج پر شائع ہو گی۔ان شاءاللہ